جلد [illegible] جولائی [illegible] عدد [illegible]

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ
ابوالاعلیٰ مودودی

۵ الف ذیلدار پارک اچھرہ۔ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۴	جولائی ۱۹۷۰ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۹۰ھ	عدد ۵

مغربی پاکستان		مشرقی پاکستان
چندہ سالانہ: آٹھ روپے	ماہنامہ ترجمان القرآن	(بذریعہ ہوائی ڈاک)
فی پرچہ: ۸۰ پیسے	۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور	فی پرچہ ۹۰ پیسے سالانہ ۱۰ روپے
		عام ڈاک: ۸۰ پیسے سالانہ ۸ روپے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

گذشتہ ماہ ان صفحات میں ہم نے جماعت اسلامی کے ارکان، ہمدردوں اور بہی خواہوں کی خدمت میں چند گزارشات پیش کی تھیں۔ اس مرتبہ ہم چند باتیں ملک کے غیر جانبدار حضرات اور جماعت اسلامی کے مخالفین سے بھی کہنا چاہتے ہیں۔ ہم بارگاہِ خداوندی سے دعا کرتے ہیں کہ وہ علیم و خبیر ذات ان نازک حالات میں انہیں سمجھ بوجھ عطا کرے اور وہ محض تعصب یا مفاد پرستی میں اندھے ہو کر کوئی غلط اقدام نہ کر بیٹھیں۔

پہلے گروہ سے ہم بڑے احترام کے ساتھ یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے ضمیر کو ٹٹولے اور یہ معلوم کرے کہ جماعت اسلامی کے معاملے میں وہ غیر جانبدار ہی سہی مگر کہیں اسلام کے معاملے میں بھی وہ غیر جانبدار تو نہیں ہو گیا؟ جماعت اسلامی کو اگر بعض لوگ پسند نہیں کرتے یا اس کے کسی طرزِ عمل اور اس کی کسی روش سے انہیں اختلاف ہے تو انہیں اس کا پورا حق ہے، مگر انہیں دیکھنا چاہیے کہ اُن کی اس ناپسندیدگی اور ان کے اس اختلاف سے کہیں کفر و الحاد کو تو فائدہ نہیں پہنچ رہا؟ تاریخ میں اس قسم کی غیر جانب داری یا دوسرے لفظوں میں عافیت کوشی سے قوموں اور ملکوں کو شدید نقصانات پہنچے ہیں بلکہ بے شمار مملکتیں تباہ ہوئی ہیں۔

عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ جب دو گروہ برسرِ پیکار ہوتے ہیں تو بعض لوگ جنہیں دونوں گروہوں سے کچھ نہ کچھ اختلافات ہوتے ہیں وہ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ اُن دونوں کے ٹکرانے سے اُن کی قوت کمزور ہو گی اور عافیت پسند اور غیر جانبدار گروہ کو آگے بڑھنے اور اقتدار حاصل کرنے

کے مواقع حاصل ہو جائیں گے۔ اس لیے وہ دونوں گروہوں کے بارے میں بڑے چچے تلے الفاظ میں نفرین بھیجتے رہتے ہیں۔ کبھی ایک کی خامی بیان کر دیتے ہیں اور کبھی دوسرے کے طرزِ عمل سے شکایت کا اظہار کر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ "ثالث بالخیر" بن کر تماشہ دیکھتے ہیں اور دونوں گروہ جب ٹکرا ٹکرا کے پاش پاش ہو جاتے ہیں تو پھر وہ میدان میں اُتر کر اس پر قبضہ جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔

جس طرزِ عمل کو یہ "ثالث بالخیر" طبقہ بظاہر اعتدال پسندی اور غیر جانبداری کی روش خیال کرتا ہے اور اپنے خیال میں جسے وہ ملک و قوم کی خدمت سمجھتا ہے وہ درحقیقت عافیت کوشی اور مفاد پرستی کی روش ہے جو قومی اور ملکی نقطۂ نظر سے بڑی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ روش عاقبت نا اندیشی کے اعتبار سے کچھ اس نوعیت کی ہوتی ہے کہ کسی امن پسند شہری کے مکان پر چند ڈاکو حملہ آور ہو کر اس کی اولاد کو قتل کرنا اور اس کے مال کو لوٹنا شروع کر دیں اور اہلِ خانہ اگر ڈاکوؤں کی مزاحمت پر آمادہ ہو جائیں تو آس پاس کے پڑوسی اس خونی ڈرامہ کو بڑے ٹھنڈے جذبات کے ساتھ دیکھتے رہیں اور بڑے نصیحت آمیز لہجے میں یہ آواز بلند کرتے رہیں کہ آپ لوگوں کو اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیے۔ تمہاری انتہا پسندانہ روش سے خون خرابہ ہونے کا خطرہ ہے جو کسی طرح بھی درست نہیں۔ یہ ایک ایسی نصیحت ہے جس سے "ثالث بالخیر" وقتی طور پر "تر فُّع" کا کیف اور غیر جانبداری سے حاصل ہونے والی عارضی عافیت حاصل کر سکتا ہے مگر اس طرزِ عمل سے وہ نہ تو کسی ظالم کا ہاتھ روک سکتا ہے اور نہ مظلوم کو ظلم سے بچا سکتا ہے اور نہ خود اپنے آپ کو زیادہ دیر تک ظلم سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ ظلم ایک اندھی بہری قوت ہے۔ وہ جب ایک مرتبہ میدان میں نکل پڑتی ہے تو پھر اس کی تاخت کسی حد پر جا کر رک نہیں جاتی بلکہ ایک کو تختۂ مشق بنا چکنے کے بعد دوسرے کی طرف بڑھتی ہے، یہاں تک کہ کوئی اس کی دست برد سے بچا نہیں رہ جاتا۔ ظلم کو روکنے کی ایک ہی صورت ہے کہ اسے ایک طاقت بن کر سرگرمِ عمل ہونے سے پہلے ہی روک دیا جائے۔ لیکن اگر استبداد کا یہ بے حس انجن ایک مرتبہ حرکت میں آ کر لڑھکنا شروع کر دے تو پھر اس کی روک کا کوئی انتظام نہیں ہو سکتا بلکہ جو بھی اس کی راہ میں حائل ہوتا ہے وہ خود بھی اُس کی لپیٹ میں آ کر ہلاک ہو جاتا ہے۔

انسان کے سفلی جذبات میں سب سے اسفل جذبہ ظلم ہے جو بہت سے دوسرے ناپاک اور مذموم جذبات مثلاً خود غرضی، خود پسندی، حسد، غرور و تکبر، انسانیت سے نفرت، جذبۂ تعمیر کے فقدان، پست ہمتی اور بزدلی سے عبارت ہوتا ہے۔ آدمی کے اچھے اور بُرے جذبات کے مابین کچھ عرصہ تک کشمکش جاری رہتی ہے مگر بیماری کے جراثیم کی طرح جب بُرے جذبات اچھے احساسات پر غالب آجاتے ہیں تو اُس کا دل جذبۂ رحم سے یکسر خالی ہوجاتا ہے اور اسے ظُلم کی تاریکی پوری طرح گھیر لیتی ہے۔ پھر یہ شخص اُن بُرے جذبات کے ساتھ لوگوں کو اپنے ظلم کا تختۂ مشق بناتا ہے۔ جس گروہ کے دل لطیف احساسات کے مولد و مسکن ہونے کے بجائے جبر و استبداد کے ظلمت کدے ہوں اور جس کے افراد کو ہمیشہ ایک ہی فکر دامن گیر رہتی ہو کہ کسی طرح اپنے مخالفین کو بے دردی کے ساتھ دُنیا سے مٹا دیا جائے اُس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ نصیحت اور بھلائی کی کوئی بات سُننے پر آمادہ ہوگا پرلے درجہ کی سادگی ہے۔

بھلائی کی بات تو اُن لوگوں کے قلب و دماغ پر اثر کرتی ہے جو انسانیت کے جوہر سے یکسر محروم نہ ہو چکے ہوں۔ اور اس جوہر کی سب سے بڑی علامت یہ ہوتی ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کو نیست و نابود کرنے کے درپے نہیں ہوتا بلکہ انہیں ترغیب و تلقین اور معقول اور شائستہ انداز میں، دلائل کی قوت کے ساتھ اپنا ہمنوا بناتا ہے۔ مگر جو لوگ اس صحیح روش کو چھوڑ کر جلاؤ، گھیراؤ کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کرنے کا عزم رکھتے ہوں اُن سے ملک و ملّت کو بچانے کی صورت بجز اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ رائے عام کو اس قسم کے ظالمانہ اور انسانیت کُش طرزِ عمل کے خلاف بیدار کیا جائے اور ظلم و استبداد کے ان اٹھتے ہوئے طوفانوں کو فرو کرنے کے لیے قوم کو تیار کیا جائے۔

اگر اس اندھی جارحیت اور اس کے خوفناک عزائم اور اس کے رُوح فرسا اور المناک نتائج سے عوام کو بر وقت آگاہ کرنا اور اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے انہیں آمادہ کرنا غیر اعتدال پسندانہ روش ہے تو پھر اعتدال پسندانہ روش تو یہی ہو سکتی ہے کہ ظالم کو ظلم کی کھلی چھٹی دے دی جائے تاکہ وہ جس طرح چاہے "مشقِ ناز" کرتا رہے اور کوئی آواز نہ اس پر نفرین بھیجنے والی اور کوئی ہاتھ اس کا ہاتھ روکنے والا نہ رہے اور عوام بڑی بے چارگی اور بے بسی مگر مکمل خاموشی کے ساتھ اپنی بربادی کو دیکھتے رہیں۔ اگر یہ طرزِ عمل ہی بعض لوگوں کے نزدیک اعتدال کی راہ ہے تو ہم پورے وثوق کے ساتھ کہتے

ہیں کہ اس سے زیادہ خطرناک کوئی دوسری راہ نہیں۔

ایک ملک نہیں بلکہ پورا شرقِ اوسط اسی راہ پر چل کر تباہ و برباد ہوا ہے اور ابھی مزید ہو رہا ہے۔ وہاں جو خونی ڈرامہ کھیلا گیا ہے اس کے سارے مناظر اسی اندازِ فکر کی بھیانک تصویر پیش کرتے ہیں ان سارے ممالک میں اسلام کا نام تو لیا جاتا تھا مگر اسلام کسی معاشرے کو جن رُوحانی، اخلاقی اور دنیوی برکات سے فیض یاب کرتا ہے، یہ ممالک کافی حد تک اُن سے محروم تھے۔ اس کی وجہ برسرِ اقتدار طبقوں کی غیر اسلامی روش تھی۔ ان لوگوں نے اسلام کو استحصال کا ایک ذریعہ بنا رکھا تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً اسلام سے اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار تو کرتے رہتے مگر اسلام اپنے ماننے والوں سے جس ایثار اور خلوص، جس ضبطِ نفس، جس خدا خوفی اور پاک بازی اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے جس گہری لگن کا مطالبہ کرتا ہے اس کی کوئی جھلک اُن کی عملی زندگی میں نظر نہ آتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عام مسلم سوسائٹی اسلام کے ان جھوٹے دعویداروں سے بدظن ہو گئی۔ اس خلا کو بھانپتے ہوئے اہلِ مغرب نے ان ممالک میں اپنے باطل افکار و نظریات کو پھیلانا شروع کر دیا۔ اسلامی تعلیمات سے نا آشنا اور اسلام کے نام پر ریشہ دوانیوں سے آشنا نوجوانوں کو جب یورپ میں پڑھنے اور تربیت پانے کے مواقع ملے تو انہوں نے مغربی تہذیب سے گہرے اثرات قبول کیے، اور وہ مشرقی ممالک میں واپس آکر ان باطل نظریات کے پُرجوش مبلغ اور داعی بن گئے۔ ان کے اِس طرزِ عمل کی ایک بڑی وجہ اُن کی اپنی ذہنی اور عملی آمادگی بھی تھی۔ یورپ میں کچھ مدت رہنے کے بعد انہیں بعض ایسی قبیح عادات لگ چکی تھیں جنہیں ایک مسلم معاشرہ کسی طرح بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ دوسری طرف یہ نوجوان ان بُری عادات کو ترک کرنے پر بھی آمادہ نہ تھے۔ چونکہ یہ لوگ اُونچے گھرانوں کے چشم و چراغ تھے اس لیے جب انہوں نے مغربی ممالک سے واپس آکر اونچے مناصب سنبھالے تو انہوں نے اس امر کی کوشش کی کہ معاشرے کے اندر ایسا بگاڑ پیدا کیا جائے جو اُن کے اپنے اخلاقی بگاڑ کو بلا چون و چرا قبول کر لے۔ ادھر مغربی ممالک نے ان مشرقی "صاحب بہادروں" کی پُوری قوت سے پُشت پناہی شروع کر دی۔ اور اس طرح مسلم ممالک میں ایک خوفناک سازش اور کشمکش کا آغاز ہوا۔ اہلِ مغرب نے مسلمان ممالک کو خود بھی جہاں تک ہو سکا تاخت و تاراج کیا مگر ان کی زیادہ تر کوشش اس بات پر مرکوز رہی کہ ان ممالک کے

نوجوانوں کے ذریعے اُن کے معاشرے میں نقب لگائی جائے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ہر طرح کی مدد پہنچائی۔ مغرب کے فکری اسلحہ خانہ سے انہیں باطل افکار و نظریات بھی دیئے، امورِ مملکت میں انہیں فیصلہ کن حیثیت بھی دلوائی اور مال و زر سے اُن کی دستگیری بھی کی۔ وہ بالکل صحیح طور پر یہ سمجھتے تھے کہ جس کام کو اہلِ مغرب دو سو سال کے لمبے عرصے میں براہِ راست تسلط کے باوجود پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ناکام رہے ہیں اس کام کو مغرب کے پرستار نوجوان جلد از جلد کامیابی کے مراحل تک پہنچا دیں گے۔

مغربی افکار کے حامل ان لوگوں کو مسلم معاشرے نے گو ابھی تک قیادت کے لیے قبول نہیں کیا ہے لیکن چونکہ اُن کی پُشت پر مغرب کی پوری قوت موجود ہے اس لیے اُن کے خیالات، ان کی شخصیتوں اور اُن کے کاموں کو بڑی عیاری کے ساتھ عوام کے سامنے لایا جاتا ہے جیسے کہ وہ مسلم قوم کی کوئی بہت بڑی قوت ہیں۔ پھر انہیں کسی معاشرے میں غیر معمولی طور پر مؤثر اور صاحبِ اختیار بنانے کے لیے نہ صرف اُن کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں بلکہ عوام کو دہشت زدہ کرنے کی انہیں باقاعدہ تربیت بھی دی جاتی ہے کہ "خاموش اکثریت" ان کی ظاہری قوت سے خوفزدہ ہو کر اپنا سارا وزن اُن کے پلڑے میں ڈال دے۔ یہ جبر و تشدد کے نعرے اور پروگرام کسی وقتی ہیجان کا نتیجہ نہیں بلکہ استبداد کو مسلط کرنے کا باقاعدہ ایک منصوبہ ہے۔

آج دنیا کا کونسا ایسا ملک ہے جہاں مسلم معاشرے کی عظیم اکثریت اور مغربی تہذیب کے چند سر پھرے پرستاروں کے درمیان یہ ہولناک جنگ برپا نہیں ہے۔ مصر اسی کشمکش سے تباہ ہوا۔ سوڈان، شام، عراق، الجزائر غرض دنیا کے سارے ممالک کو اس آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور ان کا جو حشر ہوا ہے اور جو ابھی ہو رہا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ اسے دیکھنے کی کوئی حساس دل تاب نہیں لا سکتا۔ اقلیت کو اکثریت پر اس کی منشا و مرضی کے علی الرغم مسلط کرنے اور اسے اپنے دلپسند نہج پر زبردستی گھسیٹنے کے جنون نے بھائی کو بھائی کے خلاف صف آرا کر دیا ہے اور ایک ہی معاشرے کے افراد ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن کر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے میں مصروف ہیں۔

صحیح بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو دو سو سال کی غلامی نے اس قدر تباہ و برباد نہیں کیا تھا جو آج آپس کی اس مجنونانہ کشمکش نے کیا ہے۔ اس باہمی سرپھٹول کی وجہ سے مسلم سوسائٹی کی قوتیں ضائع ہوئی ہیں۔ اور اس کشمکش کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ اس میں ایک محدود سا طبقہ مسلم قوم کی اس رگ پر تیشہ چلانے کے درپے ہے جو رگِ جان کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ ان مسلمان ممالک کو اس کشمکش سے آخر کیا فائدہ ہوا ہے؟ کیا اُن کی قوت بڑھی ہے؟ کیا اُن کی حیثیت بہتر ہوئی ہے، کیا دنیا میں ان کا سیاسی دبدبہ قائم ہوا ہے؟ یہ سارے ممالک جو اس کش مکش کی آماجگاہ بنے ہیں ان میں جان و مال، عزت و آبرو کے ناقابلِ تصوّر زیاں کے علاوہ معاشی، سیاسی اور اخلاقی طور پر زبردست تباہی ہوئی ہے۔ خوف و ہراس کی وجہ سے سرمایہ کاری میں غیر معمولی کمی ہوئی ہے جس سے عوام کی معاشی حالت دن بدن دگرگوں ہوتی جا رہی ہے۔ وہ فوج جس پر ان ممالک کے عوام بڑا ایثار کر کے بے پناہ دولت خرچ کر رہے ہیں اور جس سے وہ بجا طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ انہیں دشمنوں کے حملوں سے بچائے گی وہ خود ان ایثار کرنے والوں کے خلاف صف آرا ہے۔

اسلام، اور اس کی اخلاقی اور دینی روایات نے مسلم معاشرے کے اندر ایک تہذیب اور وحدتِ فکر پیدا کر رکھی تھی۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی عزت و آبرو کا محافظ تھا۔ مگر آج باطل ازموں کے پرستاروں نے مسلم معاشرے کے افراد کو ایک دوسرے کا دمساز اور رفیق بنانے کے بجائے ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ہے۔ یُوں محسوس ہوتا ہے کہ ہر فرد دوسرے کی جان لینے کے درپے ہے اور یہ مسلم معاشرہ جو کبھی شرافت اور باہمی اخوت کی بنا پر دنیا میں ممتاز تھا آج ایک ایسے خوفناک جنگل کا نقشہ پیش کرتا ہے جو درندوں سے آباد ہے۔

مشرق اوسط کو پوری طرح برباد کر دینے کے بعد اب یہ باطل قوتیں پاکستان کی طرف متوجہ ہوئی ہیں، کیونکہ یہ اُن کے نزدیک اسلام کا سب سے مضبوط حصار رہا ہے، جب تک یہ دینی اعتبار سے پاش پاش نہیں ہو جاتا مادیت اور مغربی تہذیب کے عالمگیر تسلط کا خواب اُن کے خیال میں شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی ساری قوتوں کو مجتمع کر کے یہاں لا ڈالا ہے۔ اور جو نتائج

انہوں نے دوسرے مسلم ممالک میں پچاس برس کی محنتِ شاقہ کے بعد حاصل کیے ہیں وہ انہیں اس ملک میں دو چار برسوں میں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ان کے نقطۂ نظر کے مطابق پاکستان اُن کے لیے سب سے بڑا چیلنج بھی ہے۔ اور اگر وہ اپنے عزائم میں کامیاب ہو جائیں تو سب سے بہتر نتائج بھی پیدا کر سکتا ہے۔ یہ ان کے لیے سب سے زبردست چیلنج اس بنا پر ہے کہ دنیا میں یہ واحد ملک ہے جو اس بیسویں صدی میں قومیت کے مغربی تصور کے دورِ عروج میں پورے سیاسی شعور کے ساتھ مذہب کی بنیاد پر معرضِ وجود میں آیا۔ اس بنیاد پر جس قدر شکوک و شبہات اور جس قدر بدگمانیاں پیدا ہو سکتی ہیں وہ سب ماضی میں پیدا ہوئیں، مگر مسلمانوں نے عقلی و نقلی دلائل اور عزمِ راسخ اور جوشِ عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ مسلمان قوم کے بارے میں یہ سارے خیالات اوہام باطل ہیں اور اس کی قومیت کی بنیاد دین کے علاوہ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ پھر ان باطل قوتوں کو اس امر کا بھی پوری طرح احساس ہے کہ اس ملک میں سفید سامراج اور سرمایہ داری کے لیے کوئی گوشۂ التفات موجود نہیں۔ انگریز نے مسلم قوم کے ساتھ جو زیادتیاں کی ہیں اور اس پر جس قسم کے مظالم ڈھائے ہیں اور اسے جس وحشت ناک انداز سے برباد کیا ہے۔ یہ سارے زخم ابھی تک اس کے سینے میں تازہ ہیں اور اُن سے برابر خون رس رہا ہے۔ اس کے علاوہ جس قسم کے لاینحل مسائل پیدا کر کے انہوں نے ملک کو چھوڑا ہے اور جانے کے بعد بھی اپنے بھائی بندوں سے مل کر جس قسم کی کھلی اور چھپی سازشیں کرنے میں وہ ابھی تک مصروف ہیں اُن کی موجودگی میں اس بات کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں ہو سکتا کہ سفید سامراج کو یہاں قدم جمانے کا کوئی موقع مل سکے گا۔ یہ سامراج اپنے ساتھ جو معاشی نظام سرمایہ داری کی صورت میں لایا ہے اس کی تباہ کاریوں سے ایک فرد بھی ناآشنا نہیں بلکہ قوم کی عظیم اکثریت اس کے زخموں سے کراہ رہی ہے۔ ملکی دولت کے اسّی فیصد کا صرف بیس خاندانوں میں ارتکاز، غیر ملکی آقاؤں کی خدمت کے صلے میں جاگیرداریوں کا قیام، سٹہ، سُود خوری اور دوسرے ناجائز ذرائع کی مدد سے دولت کی غیر عادلانہ بلکہ انتہائی غیر منصفانہ تقسیم اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے غربت و افلاس کے بڑے المناک مناظر کو اس ملک کے رہنے والے آخر کس طرح بھلا سکتے ہیں۔

اس ملک کی سو فیصد آبادی سفید سامراج اور اس کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی نظام کو سرتاپا لعنت سمجھتی ہے یہاں ایک لاکھ میں سے ایک متنفّس بھی ایسا نہیں مل سکتا جو اس لعنت کو اپنے

حق میں کسی طرح بھی خیر سمجھتا ہو۔

اہلِ مغرب کا اگر یہاں تسلط قائم ہو سکتا ہے تو سُرخ سامراج کی مدد سے اشتراکیت کی صورت میں ہی قائم ہو سکتا ہے۔ سُرخ سامراج یہاں ابھی تک آزمایا نہیں گیا اس لیے بعض لوگ اس کی تباہ کاریوں کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتے۔ اشتراکیت چونکہ ایک ایسی انقلابی قوت ہے جس کے ذریعے اس ملک کے مروّجہ نظام کو تہ و بالا کیا جا سکتا ہے اس لیے بعض انجان اس کی اس غیر معمولی قوت سے خیر کی امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سیلاب اس ملک کی ساری غلاظتوں کو اپنے ساتھ بہالے جائے گا۔ مگر انہیں اس بات کا علم نہیں کہ اس کے آنے سے غلاظتیں تو شاید کم ہی دُور ہوں البتہ اخلاقی اور روحانی اقدار کا یکسر خاتمہ ہو جائے گا۔ اور پھر یہ سیلاب اتنی قوت، اتنی تندی و تیزی اور اتنے خوفناک گرداوں کے ساتھ آئے گا کہ اُن کی گرفت سے نکلنا قریب قریب ناممکن ہوگا، پُورا معاشرہ اس کے نیچے دب کر رہ جائے گا۔ اور عوام میں سرے سے یہ قوت و طاقت ہی نہ رہے گی کہ وہ اس کے بوجھ اور بھنور سے آزاد ہو کر سطح پر آئیں اور دُنیا کو اپنے مصائب اور اپنی محرومیوں سے آگاہ بھی کر سکیں۔

جماعت اسلامی اور دین کی علمبردار بعض دوسری جماعتوں کا گناہ صرف یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو سُرخ سامراج کے جلو میں آنے والے خطرات سے آگاہ کر رہی ہیں اور انہیں یہ بتا رہی ہیں کہ جن برائیوں کو ختم کرنے کے لیے تم اشتراکیت کی طرف لپک رہے ہو، سُرخ انقلاب کے بعد یہ ساری برائیاں جوں کی توں ایک مُستبد اور جابر آمریت کے زیرِ سایہ قائم رہیں گی اور پرورش پائیں گی۔ البتہ جو خیر اور بھلائی اسلام کی صورت میں تمہارے پاس موجود ہے اس سے تم بالکل محروم کر دیئے جاؤ گے۔

یہ وُہ گناہ ہے جس کی وجہ سے جماعتِ اسلامی اور دوسری خادمِ دین جماعتوں پر غیظ و غضب کی آگ برسائی جا رہی ہے۔ یہ کوئی اتفاقی حادثہ یا وقتی جوش نہیں بلکہ یہ کام شروع ہی سے ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت خوب سوچ سمجھ کر کیا جا رہا ہے۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آتے ہی ان باطل قوتوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح بھانپ لیا تھا کہ دینی محاذ پر جماعت اسلامی ہی ایک ایسی قوت ہے جو اپنا ایک واضح پروگرام رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنی ایک مضبوط تنظیم بھی رکھتی ہے۔ اس لیے سب سے

زیادہ یلغار اسی کے خلاف شروع ہوتی۔ ہر حکومت نے اسے اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھا اور ہر بہانے اسے دبانے اور مٹانے کی کوشش کی۔ اسی طرح اس ملک کی ہر باطل قوت نے جماعت اسلامی کو عوام میں بدنام کرکے اس کی طاقت کو توڑنے اور اس کا شیرازہ منتشر کرنے کی سعی کی۔ ان قوتوں کو جماعت اسلامی کے وزن کا اچھی طرح اندازہ رہا ہے اور وہ اس حقیقت سے بھی پوری طرح آگاہ رہی ہیں کہ یہی جماعت اُن کے ناپاک عزائم کی تکمیل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور اگر وہ اسے رستے سے ہٹانے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر وہ آسانی سے میدان مار لیں گی۔ جماعت کے خلاف یہ سارا غیظ و غضب ایک نہایت گہرے اندرونی اضطراب کا پتہ دیتا ہے۔

عافیت کوشی کے سکون کو برقرار رکھنے اور غیر جانبداری کے بلند مقام پر فائز رہ کر اپنے آپ کو گالیوں اور الزامات کے چھینٹوں سے بچانے کے لیے یہاں کی "خاموش اکثریت" اور بعض سیاسی جماعتیں جو طرز عمل چاہیں اختیار کریں مگر انہیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اگر وہ اسلام کے معاملے میں مخلص ہیں اور وہ یہاں اسلام کے علاوہ کسی دوسرے نظام کے نفاذ کو برداشت نہیں کر سکتیں تو وہ ان گالیوں اور الزام تراشیوں سے بھی کبھی نہیں بچ سکتیں۔

اس انداز پر سوچنے والے آج اگر اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہوتے اس کشمکش سے بے تعلق رہنا چاہتے ہیں تو رہیں۔ ہم اُن سے قطعاً کوئی تعرض نہیں کرنا چاہتے۔ مگر ہمیں جس طرح اس بات کا یقین ہے کہ شام کو ڈوبنے والا سورج کل صبح بالضرور طلوع ہو گا اس سے زیادہ یقین اور وثوق کے ساتھ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ظالموں کے ہاتھ سے اگر آج جماعت اسلامی محفوظ نہ رہے تو کل اُن کے گریبان بھی محفوظ نہ ہوں گے معاملہ سارا تقدیم و تاخیر کا ہے۔ ملک کے اندر اور باہر کی باطل قوتوں کو یہاں اسلام کی بیخ کنی کرنی ہے کیونکہ اسی ذریعہ سے مشرقی اور مغربی پاکستان کا رشتۂ اخوت ٹوٹتا ہے اور خود مغربی پاکستان میں بھی علاقائی عصبیت ابھر کر اس کے شیرازہ کو منتشر کر سکتی ہے۔ اسلام کی بنیاد پر پاکستان کے وجود کے قائم رہنے سے مغربی سامراج اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل نہیں کر سکتا اگر اسے اس خطے میں اپنے استعماری عزائم کی تکمیل درکار ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس سرزمین سے اسلام کو نکال دے۔

اپنے آپ کو ان باطل پرستوں کی دستبرد سے محفوظ سمجھنے والے لوگوں کو عافیت کے گوشوں سے ذرا باہر جھانک کر دیکھنا چاہیے کہ ان لوگوں کی یورش کا انداز کیا ہے۔ یہ لوگ جماعت اسلامی اور مولانا مودودی اور اسلام کے دوسرے بہی خواہوں کو آیا محض اس لیے ننگی گالیاں دیتے ہیں کہ انہیں ان سے کوئی معقول وجہِ شکایت ہے؛ یا یہ اُس شدید جھنجلاہٹ کا اظہار ہے جو انہیں اپنے مقصد کی راہ میں حائل ہوتا دیکھ کر اُن کے اندر پیدا ہوئی ہے؛

اگر وجہِ شکایت معقول ہو تو اس کے اظہار کا انداز بھی معقول اور شائستہ ہوتا ہے اور شکایت کو اسی دائرے تک محدود رکھا جاتا ہے جس کے بارے میں فی الواقع شکایت ہوتی ہے۔ لیکن جہاں کسی فرد یا گروہ کو اپنے مقاصد کی راہ کا سنگِ گراں سمجھ لیا جائے تو پھر شکایت کا اظہار شرافت سے نہیں کیا جاتا بلکہ جھوٹ، فریب، افترا پردازی اور بدزبانی کی یورشوں سے کیا جاتا ہے۔ اور اس بات کی پوری کوشش کی جاتی ہے کہ کوئی ایک لمحہ بھی ایسا گزرنے نہ پائے جس میں اپنے مخالف کو پوری طرح ذلیل و رسوا نہ کر دیا جائے۔

اس وقت بظاہر اس مجنونانہ عداوت اور دشمنی کا رُخ چند افراد اور حلقوں کی طرف ہے لیکن اگر ذرا دقّتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ عداوت اور دشمنی درحقیقت اس نظامِ حیات کے خلاف ہے جو اُن کے دلپسند نظام سے متصادم ہے۔ رائے عام کے خوف کی وجہ سے اُن میں ابھی اتنی جرأت پیدا نہیں ہوئی کہ وہ اس نظام کے خلاف کھل کر کوئی بات کہہ سکیں۔ اس لیے وہ اپنے دل کی بھڑاس اُن جماعتوں اور افراد کو گالیاں دے کر نکالتے ہیں جو اُن کے نزدیک اسلام کی قوت ہیں اور جن کی وجہ سے اُن کے عزائم بروئے کار نہیں آ رہے۔ اس حقیقت کو جاننے کے لیے کسی لمبی چوڑی تحقیق کی ضرورت نہیں، صرف چند پہلوؤں پر غور کرنے سے یہ حقیقت منکشف ہو سکتی ہے۔

سب سے پہلے اس بات پر غور کیجیے کہ اگر ان لوگوں کو اسلام ہی عزیز ہے تو پھر یہ لوگ اسلام کے ساتھ دوسرے ازموں کی پیوندکاری یا اسلام کو دوسرے ازموں کے مطابق ڈھالنے کی کوششیں کیوں کرتے رہتے ہیں؟ اس قسم کی کوششیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ یہ اسلام کو ایسا مکمل ضابطۂ حیات

نہیں سمجھتے جو ہر دَور کے لیے صحیح اور برحق ہے۔ پیوندکاری کی ضرورت اس وقت محسوس ہوتی ہے جب کوئی نظام ناقص ہو اور اُسے بہتر بنانے کے لیے کسی دوسرے نظام کے اصول اس میں شامل کرنے کی ضرورت پیش آتے۔ یا پھر کسی نظام کو وقت کے غالب نظاموں کے سانچے میں ڈھالنے کا احساس اس وقت پیدا ہوتا ہے جب لاشعور میں یہ بات موجود ہو کہ ہمارا اپنا نظام بوسیدہ ہو چکا ہے اور وہ وقت کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا۔

دوسری چیز جس سے کسی تحریک کے رجحان کا اندازہ ہو سکتا ہے وہ اُس کا طرزِ عمل ہوتا ہے۔ پاکستان میں تقریباً ساری سیاسی پارٹیاں اسلام کا نام لیتی ہیں، مگر عملی زندگی میں ان کی سعی و جہد دیکھنے سے اس حقیقت کا کھوج لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام کے معاملے میں یہ کتنی مخلص ہیں۔ مثلاً اسلام کا نام لینے والی جن پارٹیوں کے جلوسوں اور اجتماعات میں رقص ہوتے ہوں، اور اپنے مخالفوں کو ننگی گالیاں دی جاتی ہوں اُن کی اسلام پسندی کا اندازہ تو ان کے افعال ہی سے ہو سکتا ہے۔

تیسری چیز کسی پارٹی کا وہ مزاج اور اندازِ فکر ہے جو اس کے کارکنوں کی سیرت و کردار کے اندر جھلکتا ہے۔ اگر کسی تحریک کا مزاج اسلامی ہوگا تو پہلی منزل پر اس کے کارکنوں کے دل میں شعائرِ دین کا احترام پیدا ہوگا۔ اور ان کے دل میں فرائضِ اسلام کی پابندی کا ذوق اور ولولہ بھی اُبھرے گا۔ لیکن اگر کسی تحریک کے کارکن دین کے شعائر کا مذاق اڑاتے رہیں، فرائض سے گریزاں اور کبائر کے مُرتکب نظر آئیں تو اس سے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ اُن کے دل اسلام کے خلاف نفرت اور کدورت سے بھرے ہوئے ہیں اور یہی وجہ ہے وہ شعائرِ دین کا مذاق اڑاتے رہتے ہیں جس محفل میں نماز کا سوانگ رچا کر علانیہ شراب خوری کی جاتی ہو اور جس سے حاضرین لطف اندوز ہوتے ہوں اس کے متعلق یہ سوچنا کہ یہاں اسلام کے لیے عزّت و احترام کا کوئی گوشہ موجود ہے، محض دیوانگی ہے۔

ہم نے اُوپر جن تین پہلوؤں کا ذکر کیا ہے وہ کوئی ایسے چھپے ہوئے حقائق نہیں جن سے ملک کی عام آبادی واقف نہ ہو۔ ہر شخص جو ذرا آنکھیں کھول کر چلنے کا عادی ہے اور معاملات کی معمولی سُوجھ بوجھ رکھتا ہے وُہ انہیں آسانی سے دیکھ اور سمجھ سکتا ہے۔ پھر ان حقائق کے سامنے آجانے کے بعد اس بات کا اندازہ لگانا بھی کوئی مشکل نہیں کہ ان سرگرمیوں کے پیچھے کونسے محرکات اور عوامل

کام کر رہے ہیں اور ان کے بڑھنے اور پھلنے پھولنے سے اسلام اور مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا! اللہ تعالیٰ پاکستان اور اہلِ پاکستان کو ان کے بُرے نتائج سے محفوظ رکھے۔ لیکن ملک کے اندر جو سُرخ آندھیاں اُٹھ رہی ہیں وہ کسی بڑے خوفناک طوفان کا پیش خیمہ ہیں۔ جو فرد یا گروہ اُن کی قوت اور اُن کی تباہ کاریوں کو محسوس نہیں کرتا یا اُن سے اغماض برتتا ہے یا اُن کی روک تھام کے لیے جد وجہد نہیں کرتا اُسے کبھی بھی دانشمند اور ملک و ملت کا خیر خواہ نہیں کہا جا سکتا۔

ممکن ہے کہ دشمن غیر جانبداری کی روش اختیار کرنے والوں سے تعرض نہ کرے لیکن انہیں یہ بات پوری طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ وہ اِس طوفان کی زد سے کبھی بچ نہیں سکتے۔ یا تو یہ طوفان انہیں اپنے رُخ پر دھکیل کرلے جائے گا یا پھر اسلام کے پہلے حصار کو توڑنے کے بعد انہیں بھی بیخ و بُن سے اکھاڑ کر رکھ دے گا۔ اب یہ فیصلہ کرنا اُن کے اپنے اختیار میں ہے کہ وہ اپنے لیے کونسا انجام پسند کرتے ہیں؟ اگر ہوا کے رُخ کے مطابق چلنا ہی عینِ اسلام ہے اور اُن کے اسلام سے محبت کے دعوے کا یہی منشا ہے تو پھر یہ اسلام وہ دین نہیں ہو سکتا جو تمام ادیان پر غالب ہونے کے لیے آیا ہے۔ لیکن اگر اس دین سے مُراد وہ دین ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے انسانوں کی رہنمائی اور انہیں باطل نظاموں کی غلامی سے آزاد کرنے کے لیے نازل فرمایا ہے تو وہ دین اپنا ایک مستقل وجود رکھنے کی وجہ سے ہر سانچے میں ڈھلنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ بلکہ اس کا تو نوعِ انسانی سے مطالبہ یہ ہے کہ تم اپنے سارے معاملات کو اس کے مطابق ڈھال کر دنیوی اور اُخروی فلاح حاصل کرو۔ اس دینِ حق کو ماننے والے آخر باطل کی ٹکر سے کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں؟ اس معاملے میں غیر جانبداری عافیت کوشوں کو تصادم سے کس طرح بچا سکتی ہے اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

اب ایک بات ہم اُن علماء سے بھی کہنا چاہتے ہیں جو دانستہ یا نادانستہ طور پر ان باطل پرستوں کے ہاتھ میں کھیل رہے ہیں۔ ہم اُن سے بڑی دلسوزی کے ساتھ یہ گزارش کرتے ہیں کہ وہ اپنے طرزِ عمل پر سنجیدگی سے غور کریں اور یہ دیکھیں کہ ایک جماعت اور ایک شخصیت کے ساتھ اُن کی پرخاش انہیں کس مقام پر لے گئی ہے۔ عقل باور نہیں کر سکتی کہ ضد اور چڑ میں کوئی مسلمان اس سطح پر اُتر بھی سکتا ہے کہ اس

جماعت کے ہر کام اور اس کے سربراہ کی زبان و قلم سے نکلی ہوئی ہر بات میں کیڑے ڈالنا اس کی زندگی کا سب سے بڑا مشن بن جاتے اور اسی ایک کام میں وہ اپنا سارا وقت اور اپنی ساری صلاحیتیں کھپا دے۔ یہ اندازِ فکر اور طرزِ عمل ان لوگوں کو تو قطعاً زیب نہیں دیتا جو وارثانِ انبیاء کہے جاتے ہیں۔ ایک مسلمان تو فطری طور پر حق پسند اور حق پرست ہوتا ہے۔ وہ دوستی اور دشمنی دونوں میں حق و صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ جماعت اسلامی سے اگر آپ کو اختلاف ہے تو بیشک اس اختلاف کا اظہار کیجیے۔ اگر آپ کے اختلافات کی نوعیت اتنی شدید ہے کہ آپ اس کے ساتھ شامل ہو کر چل نہیں سکتے تو بیشک اپنے مقدس قافلے کو الگ چلائیے۔ اور اگر مخالفت بھی ضروری ہو تو دیانت اور شائستگی کی کسی حد کو ملحوظ رکھ کر مخالفت بھی کر لیجیے۔ لیکن اس بات پر ضرور غور کر لیجئے کہ کہیں جماعت کی دشمنی میں آپ ایسے کارواں کے ساتھ تو شریک نہیں ہو گئے جو امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفر و الحاد کی خوفناک وادیوں کی طرف دھکیل رہا ہے۔ جن لوگوں کے آپ شریک کار ہیں، جن کا ساتھ ہر معاملہ میں آپ دے رہے ہیں جنہیں ہر کام پر دنیا آپ کو شانہ بشانہ چلتے دیکھ رہی ہے، اسلام کے بارے میں ان کے نظریات کسی سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ ان کی نجی زندگی اسلام کے ساتھ ان کے تعلق کی جیسی کچھ شہادت دیتی ہے، اور پبلک میں جس کردار کا وہ مظاہرہ کر رہے ہیں، اور جن مقاصد کو لے کر وہ اس ملک میں اپنی تحریک چلا رہے ہیں، یہ سب چیزیں بھی کوئی ایسا راز نہیں ہیں جو سب کو تو نظر آتا ہو مگر آپ کی نگاہوں سے مخفی ہو۔ دنیا کے دوسرے ملکوں میں ان لوگوں کے ہاتھوں اسلام اور مسلمانوں کا جو حشر ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے وہ بھی عالم آشکارا ہے۔ آپ کو ایک دن خدا کے حضور میں پیش ہو کر اپنا حساب دینا ہے۔ اس بات کو نہ بھولیے اور اسے سوچ کر ہی اپنے لیے کوئی لائحۂ عمل از سر نو مرتب کیجیے۔ یہ بات ہمیشہ نگاہ میں رکھیے کہ انقلابی تحریکیں تند و تیز دھارے کی طرح آگے بڑھتی ہیں۔ چند افراد یا گروہوں کے اُن میں شامل ہونے سے نہ تو اُن کی تندی میں فرق آتا ہے اور نہ اُن کا رُخ تبدیل ہو سکتا ہے۔ انہیں باقاعدہ ایک عزم اور ارادے کے ساتھ چند مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لیے چلایا جاتا ہے۔ اور اُن کی روشنی ہی میں اُن کی رفتار، اُن کا مزاج اور ان کا طریق کار متعین ہوتا ہے۔ پھر افکار و خیالات کے مخصوص سرچشموں سے ان کو غذا مہیا کی جاتی ہے اور ایک خاص تنظیمی ماحول میں ان کی پرورش ہوتی ہے۔ ان تحریکات کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ چند نفوس یا چند گروہوں کی شرکت اُن کے مزاج اور ان کے رُخ کو تبدیل کر دیگی،

سکھی خام خیالی ہے۔ یہ افراد اور گروہ ان پر تو کیا اثر انداز ہوں گے، خود تنکوں کی طرح ان کے ساتھ بہہ جائیں گے اور جو اُن کے ساتھ بہنے سے ذرا گریز کریں گے انہیں اس تحریک کی کف بدہن موجیں اٹھا کر باہر پھینک دیں گی۔

علماء کے ایک گروہ کی یہ غلطی کوئی نئی نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی مرتبہ اس دلیل سے دھوکہ کھا چکے ہیں کہ اگر انہوں نے باطل مگر عوام کے لیے باعثِ کشش تحریکات کا ساتھ نہ دیا تو عوام حق سے برگشتہ ہو کر باطل کے علمبردار بن جائیں گے۔ جو لوگ حق سے برگشتہ ہو کر باطل کی غلامی کا طوق گلے میں ڈالنے کا عزم کر چکے ہیں انہیں ان حیلوں سے باز نہیں رکھا جا سکتا بلکہ دینی شکل وصورت کے لوگوں کی ان کی صفوں میں موجودگی باطل کو اپنا بھیانک چہرہ چھپانے اور اپنے ناپاک عزائم کو مقدس بنا کر پیش کرنے کا موقع بہم پہنچا دیتی ہے۔ اس قسم کے عاقبت نااندیشانہ طرزِ عمل کے نتائج تاریخ میں پوری طرح محفوظ ہیں۔ رُوس میں مُلّا نُور اور اس کے ساتھیوں نے اس دلیل کی بنیاد پر اشتراکی تحریک میں شمولیت اختیار کی۔ آغاز میں عوام کو دھوکہ دینے کے لیے اُن کی بڑی پزیرائی کی گئی۔ انہیں غریبوں اور بے کسوں کا ہمدرد بنا کر اُن کی شان میں لمبے چوڑے قصیدے پڑھے گئے۔ اور جن لوگوں نے اس تحریک کے تیور اور مزاج کو بھانپ کر اس سے الگ رہنے کا فیصلہ کیا، انہیں رجعت پسند اور سرمایہ داروں کے ایجنٹ کہہ کر خوب رُسوا اور بدنام کیا گیا۔ لیکن جب اشتراکی انقلاب کامیاب ہُوا تو مُلّا نُور اور اس کے ساتھیوں کا جو المناک حشر ہُوا اس کے تصوّر سے رُوح کانپ اٹھتی ہے۔ ظالموں نے سب سے پہلے انہی لوگوں کو یہ سوچ کر ختم کیا کہ یہ افراد جو ہمارے ساتھ اس جدوجہد میں شروع سے آخر تک شریک رہے ہیں، یہ چونکہ ہماری کمزوریوں اور ہمارے عزائم کو اچھی طرح جان چکے ہیں اس لیے یہ ہماری راہ میں حائل ہو سکتے ہیں۔ ان کی سابقہ خدمات کی بنا پر انہیں استعمار کا ایجنٹ یا عوام کا دشمن کہہ کر لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکایا نہ جا سکے گا۔ اس لیے سب سے پہلے ان سے چھٹکارا پانا چاہیے۔ چنانچہ انقلاب کے تھوڑی مدت بعد اپنے خاص گماشتوں کے ذریعے "غریبوں کے ان ہمدردوں" کے خلاف باقاعدہ ایک مہم شروع کی گئی اور ان پر وہی الزامات عائد کیے گئے جن سے بچنے کے لیے انہوں نے اشتراکی تحریک کا ساتھ دیا تھا۔ جگہ جگہ ان کے خلاف

قرار دادیں پاس ہوئیں کہ یہ مولوی عوام دشمن ہیں۔ کیونکہ یہ حلال و حرام کے مسئلے لے بیٹھے ہیں اور اس وجہ سے انقلابی قوتیں صحیح طور پر کام نہیں کر سکتیں۔ اس لیے انقلاب کے ان چھپے ہوئے دشمنوں کو سب سے پہلے ختم کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں بڑی اذیت ناک سزائیں دے کر موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔

ان عبرتناک تاریخی حقائق کی موجودگی میں ہم جب ان اشتراکیت نواز علماء کی غلط فہمیوں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں ترس آتا ہے کہ آخر کار جب ان کی آنکھیں کھلیں گی اس وقت ان پر عرصۂ حیات کس قدر تنگ ہو چکا ہوگا اور "سرمایہ داروں کے ایجنٹوں" سے بھی پہلے ان کی شامت آچکی ہوگی۔

عاقبت اندیش اور دانشمند آدمی وہ نہیں ہوتا جس کی آنکھیں بُرا انجام دیکھ کر کھُلیں بلکہ وہ شخص ہوتا ہے جو معاملات کے رُخ سے انجام کو بھانپ لے، اور اس تک پہنچنے سے پہلے اس کے تدارک کی فکر کرے۔ جس اصطلاح کو قرآن مجید نے عبرت سے تعبیر کیا ہے وہ یہی ہے کہ دوسرے کے حالات و واقعات سے سبق لیا جائے اور اپنے آپ کو بربادی سے بچایا جائے۔ سفید سامراج کی غارت گریوں سے تو آپ بخوبی واقف ہیں اور اس وجہ سے اُس کی مخالفت میں آپ بڑے سرگرم ہیں۔ یہ مخالفت بالکل بجا اور درست ہے۔ سفید سامراج نے واقعی مسلمانوں کو ناقابلِ تلافی نقصانات پہنچائے ہیں۔ لیکن آخر کیا وجہ ہے کہ سرخ سامراج کے مظالم آپ کی آنکھوں سے اوجھل ہیں؟ اگر اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں اِس وقت تک اس سے براہِ راست سابقہ نہیں پڑا ہے اور اسی وجہ سے ہم اسے اپنے اُوپر مسلّط کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تو یہ سراسر کوتاہ اندیشی ہے کیا ترکستان اور کاشغر ہم سے بہت دُور ہیں؟ کیا بخارا اور سمرقند جسم اسلامی کا کوئی حصہ نہ تھے؟ وہاں اسلام کی بیخ کنی ہوئی اور مسلمانوں کا جو حشر ہوا وہ ہماری آنکھوں کو کھولنے اور ہمارے احساسات کو بیدار کرنے کے لیے کافی نہیں؟ کیا مشرقِ اوسط کی حالتِ زار سے ہم کوئی عبرت حاصل کرنے کے لیے تیار نہیں؟ کیا ہم اس حد تک کوتاہ نظر ہو گئے ہیں کہ جب تک خود پاکستان کے باشندوں کو اشتراکیت کے الاؤ میں پھینک کر ان کا حشر نہ دیکھ لیں اس وقت تک ہمیں اس باطل نظام کی تباہ کاریوں کا یقین نہیں آئے گا۔ (باقی صفحہ ۹۱ پر)

تفہیم القرآن

المُزَّمِّل

نام پہلی ہی آیت کے لفظ المُزَّمِّل کو اس سُورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔ یہ صرف نام ہے، اس کے مضامین کا عنوان نہیں ہے۔

زمانۂ نزول اس سورۃ کے دو رکوع دو الگ زمانوں میں نازل ہوئے ہیں۔

پہلا رکوُع بالاتفاق مکّی ہے۔ اس کے مضامین اور احادیث کی روایات دونوں سے یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ مکّی زندگی کے کس دَور میں نازل ہُوا ہے، اس کا جواب ہمیں روایات سے تو نہیں ملتا، لیکن اس رکوع کے مضامین کی داخلی شہادت اس کا زمانہ متعین کرنے میں بڑی مدد دیتی ہے:

اوّلاً، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ آپ راتوں کو اٹھ کر اللہ کی عبادت کیا کریں تاکہ آپ کے اندر نبوّت کے بارِ عظیم کو اٹھانے اور اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے کی قوت پیدا ہو۔ اس سے معلوم ہُوا کہ یہ حکم حضورؐ کی نبوت کے ابتدائی دَور ہی میں نازل ہوا ہو گا جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِس منصب کے لیے آپ کی تربیت کی جا رہی تھی۔

ثانیاً، اس میں حکم دیا گیا ہے کہ نمازِ تہجّد میں آدھی آدھی رات یا اس سے کچھ کم و بیش قرآن مجید کی تلاوت کی جائے۔ یہ ارشاد خود بخود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اُس وقت قرآن مجید کا کم از کم اتنا حصّہ نازل ہو چکا تھا کہ اس کی طویل قرأت کی جا سکے۔

ثالثاً، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو مخالفین کی زیادتیوں پر صبر کی تلقین کی گئی

ہے اور کفّارِ مکہ کو عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رکوع اُس زمانے میں نازل ہوا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی علانیہ تبلیغ شروع کر چکے تھے اور مکہ میں آپ کی مخالفت زور پکڑ چکی تھی۔

دوسرے رکوع کے متعلق اگرچہ بہت سے مفسّرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ بھی مکّہ ہی میں نازل ہوا ہے، لیکن بعض دوسرے مفسّرین نے اسے مدنی قرار دیا ہے، اور اس رکوع کے مضامین سے اِسی خیال کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ اس میں قتال فی سبیل اللہ کا ذکر ہے، اور ظاہر ہے کہ مکّہ میں اس کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا تھا، اور اس میں فرض زکوٰۃ ادا کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے، اور یہ بات ثابت ہے کہ زکوٰۃ ایک مخصوص شرح اور نصاب کے ساتھ مدینہ میں فرض ہوئی ہے۔

موضوع اور مضامین: پہلی سات آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو حکم دیا گیا ہے کہ جس کارِ عظیم کا بار آپ پر ڈالا گیا ہے اس کی ذمّہ داریاں سنبھالنے کے لیے آپ اپنے آپ کو تیار کریں، اور اس کی عملی صورت یہ بتائی گئی ہے کہ راتوں کو اُٹھ کر آپ آدھی رات، یا اس سے کچھ کم و بیش نماز پڑھا کریں۔

آیت ۸ سے ۱۴ تک حضور کو تلقین کی گئی ہے کہ سب سے کٹ کر اُس خدا کے ہو رہیں جو ساری کائنات کا مالک ہے۔ اپنے سارے معاملات اُسی کے سپرد کر کے مطمئن ہو جائیں۔ مخالفین جو باتیں آپ کے خلاف بنا رہے ہیں ان پر صبر کریں، اُن کے منہ نہ لگیں اور ان کا معاملہ خدا پر چھوڑ دیں کہ وہی ان سے نمٹ لیگا۔

اس کے بعد آیات ۱۴ سے ۱۹ تک مکّہ کے اُن لوگوں کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی مخالفت کر رہے تھے، متنبّہ کیا گیا ہے کہ ہم نے اُسی طرح تمہاری طرف ایک رسول بھیجا ہے جس طرح فرعون کی طرف بھیجا تھا، پھر دیکھ لو کہ جب فرعون نے اللہ کے رسول کی بات نہ مانی تو وہ کس انجام سے دوچار ہوا۔ اگر فرض کر لو کہ دنیا میں تم پر کوئی عذاب نہ آیا

تو قیامت کے روز تم کفر کی سزا سے کیسے بچ نکلو گے؟

یہ پہلے رکوع کے مضامین ہیں۔ دوسرا رکوع حضرت سعید بن جُبیر کی روایت کے مطابق اس کے دس سال بعد نازل ہُوا اور اس میں نمازِ تہجد کے متعلق اُس ابتدائی حکم کے اندر تخفیف کر دی گئی جو پہلے رکوع کے آغاز میں دیا گیا تھا۔ اب یہ حکم دیا گیا کہ جہاں تک تہجد کی نماز کا تعلق ہے وہ تو جتنی بآسانی پڑھی جا سکے پڑھ لیا کرو، لیکن مسلمانوں کو اصل اہتمام جس چیز کا کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ پنجوقتہ فرض نماز پوری پابندی کے ساتھ قائم رکھیں، فریضۂ زکوٰۃ ٹھیک ٹھیک ادا کرتے رہیں اور اللہ کی راہ میں اپنا مال خلوصِ نیت کے ساتھ صرف کریں۔ آخر میں مسلمانوں کو تلقین کی گئی ہے کہ جو بھلائی کے کام تم دنیا میں انجام دو گے وہ ضائع نہیں جائیں گے بلکہ اُن کی حیثیت اُس سامان کی سی ہے جو ایک مسافر اپنی مستقل قیام گاہ پر پہلے سے بھیج دیتا ہے۔ اللہ کے ہاں پہنچ کر تم وہ سب کچھ موجود پاؤ گے جو دنیا میں تم نے آگے روانہ کیا ہے، اور یہ پیشگی سامان نہ صرف یہ کہ اُس سامان سے بہت بہتر ہے جو تمہیں دنیا ہی میں چھوڑ جانا ہے، بلکہ اللہ کے ہاں تمہیں اپنے بھیجے ہوئے اصل مال سے بڑھ کر بہت بڑا اجر بھی ملے گا۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے[۱]، رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم[۲]، آدھی رات، یا اس سے بھی کچھ کم کر لو، یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو[۳]، اور قرآن کو خوب ٹھیر ٹھیر کر پڑھو[۴]۔

[۱] ان الفاظ کے ساتھ حضورؐ کو مخاطب کرنے اور پھر یہ حکم دینے سے کہ آپ اٹھیں اور راتوں کو عبادت کے لیے کھڑے رہا کریں، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُس وقت یا تو آپ سو چکے تھے یا سونے کے لیے چادر اوڑھ کر لیٹ گئے تھے۔ اس موقع پر آپ کو "اے نبیؐ"، یا "اے رسول" کہہ کر خطاب کرنے کے بجائے "اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے" کہہ کر پکارنا ایک لطیف اندازِ خطاب ہے جس سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اب وہ دور گزر گیا جب آپ آرام سے پاؤں پھیلا کر سوتے تھے۔ اب آپ پر ایک کارِ عظیم کا بوجھ ڈال دیا گیا ہے جس کے تقاضے کچھ اور ہیں۔

[۲] اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ رات نماز میں کھڑے رہ کر گزارو اور اس کا کم حصہ سونے میں صرف کرو۔ دوسرا یہ کہ پُوری رات نماز میں گزار دینے کا مطالبہ تم سے نہیں ہے بلکہ آرام بھی کرو اور رات کا ایک قلیل حصہ عبادت میں بھی صرف کرو۔ لیکن آگے کے مضمون سے پہلا مطلب ہی زیادہ مناسبت رکھتا ہے اور اسی کی تائید سورۂ دہر کی آیت ۲۶ سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا "رات کو اللہ کے آگے سجدہ ریز ہو اور رات کا طویل حصہ اس کی تسبیح کرتے ہوئے گزارو"۔

[۳] یہ اُس مقدارِ وقت کی تشریح ہے جسے عبادت میں گزارنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس میں آپؐ کو اختیار دیا گیا کہ خواہ آدھی رات نماز میں صرف کریں، یا اس سے کچھ کم کر دیں، یا اس سے کچھ زیادہ لیکن اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قابلِ ترجیح آدھی رات ہے، کیونکہ اسی کو معیار قرار دے کر کمی و بیشی کا اختیار دیا گیا ہے۔

[۴] یعنی تیز تیز رواں دواں نہ پڑھو، بلکہ آہستہ آہستہ ایک ایک لفظ زبان سے ادا کرو اور ایک

ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔[۵] درحقیقت رات کا اٹھنا[۶] نفس پر قابو پانے

ایک آیت پر ٹھیرو، تاکہ ذہن پوری طرح کلامِ الٰہی کے مفہوم و مدعا کو سمجھے اور اس کے مضامین سے متاثر ہو۔ کہیں اللہ کی ذات و صفات کا ذکر ہے تو اس کی عظمت و ہیبت دل پر طاری ہو۔ کہیں اس کی رحمت کا بیان ہے تو دل جذباتِ تشکّر سے لبریز ہو جائے۔ کہیں اس کے غضب اور اس کے عذاب کا ذکر ہے تو دل پر اس کا خوف طاری ہو۔ کہیں کسی چیز کا حکم ہے یا کسی چیز سے منع کیا گیا ہے تو سمجھا جائے کہ کس چیز کا حکم دیا گیا ہے اور کس چیز سے منع کیا گیا ہے۔ غرض یہ قرأت محض قرآن کے الفاظ کو زبان سے ادا کر دینے کے لیے نہیں بلکہ غور و فکر اور تدبّر کے ساتھ ہونی چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت کا طریقہ حضرت انسؓ سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ آپ الفاظ کو کھینچ کھینچ کر پڑھتے تھے۔ مثال کے طور پر انہوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر بتایا کہ آپ اللہ، رحمان اور رحیم کو مد کے ساتھ پڑھا کرتے تھے (بخاری)۔ حضرت ام سلمہؓ سے یہی سوال کیا گیا تو انہوں نے بتایا کہ حضورؐ ایک ایک آیت کو الگ الگ پڑھتے اور ہر آیت پر ٹھیرتے جاتے تھے، مثلاً اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ پڑھ کر رک جاتے۔ پھر اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پر ٹھیرتے اور اس کے بعد رک کر مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کہتے (مسند احمد۔ ابوداؤد۔ ترمذی)۔ دوسری ایک روایت میں حضرت ام سلمہؓ بیان فرماتی ہیں کہ حضورؐ ایک ایک لفظ واضح طور پر پڑھا کرتے تھے (ترمذی۔ نسائی)۔ حضرت حُذیفہ بن یمان کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں رات کی نماز میں حضور کے ساتھ کھڑا ہو گیا تو آپ کی قرأت کا یہ انداز دیکھا کہ جہاں تسبیح کا موقع آتا وہاں تسبیح فرماتے، جہاں دعا کا موقع آتا وہاں دعا مانگتے۔ جہاں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا موقع آتا وہاں پناہ مانگتے (مسلم، نسائی)۔ حضرت ابوذر کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ رات کی نماز میں جب حضورؐ اس مقام پر پہنچے اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (اگر تو انہیں عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں، اور اگر تو ان کو معاف فرما دے تو تو غالب اور دانا ہے) تو اسی کو دہراتے رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی (مسند احمد۔ بخاری)۔

[۵] مطلب یہ ہے کہ تم کو رات کی نماز کا یہ حکم اس لیے دیا جا رہا ہے کہ ایک بھاری کلام ہم تم پر نازل

کے لیے بہت کارگر اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ دن کے اوقات میں

کر رہے ہیں جس کا بار اٹھانے کے لیے تم میں اس کے تحمل کی طاقت پیدا ہونی ضروری ہے، اور یہ طاقت نہیں اسی طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ راتوں کو اپنا آرام چھوڑ کر نماز کے لیے اٹھو اور آدھی آدھی رات یا کچھ کم و بیش عبادت میں گزارا کرو۔ قرآن کو بھاری کلام اس بنا پر بھی کہا گیا ہے کہ اس کے احکام پر عمل کرنا، اس کی تعلیم کا نمونہ بن کر دکھانا۔ اس کی دعوت کو لے کر ساری دنیا کے مقابلے میں اٹھنا، اور اس کے مطابق عقائد و افکار، اخلاق و آداب اور تہذیب و تمدن کے پورے نظام میں انقلاب برپا کر دینا ایک ایسا کام ہے جس سے بڑھ کر کسی بھاری کام کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس بنا پر بھی اس کو بھاری کلام کہا گیا ہے کہ اس کے نزول کا تحمل بڑا دشوار کام تھا۔ حضرت زیدؓ بن ثابت کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اس حالت میں نازل ہوئی کہ آپ اپنا زانو میرے زانو پر رکھے ہوئے بیٹھے تھے۔ میرے زانو پر اس وقت ایسا بوجھ پڑا کہ معلوم ہوتا تھا اب ٹوٹ جائے گا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے سخت سردی کے زمانے میں حضورؐ پر وحی نازل ہوتے دیکھی ہے، آپ کی پیشانی سے اس وقت پسینہ ٹپکنے لگتا تھا (بخاری، مسلم، مالک، ترمذی، نسائی)۔ ایک اور روایت میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ جب کبھی آپ پر اس حالت میں وحی نازل ہوتی کہ آپ اونٹنی پر بیٹھے ہوں تو اونٹنی اپنا سینہ زمین پر ٹکا دیتی تھی اور اس وقت تک حرکت نہ کر سکتی تھی جب تک نزولِ وحی کا سلسلہ ختم نہ ہو جاتا (مسند احمد، حاکم، ابن جریر)۔

۶ے اصل میں لفظ ناشئۃ اللیل استعمال کیا گیا ہے جس کے متعلق مفسرین اور اہلِ لغت کے چار مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ ناشئۃ سے مراد نفسِ ناشئۃ ہے، یعنی وہ شخص جو رات کو اٹھے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد رات کے اوقات ہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس کے معنی ہیں رات کو اٹھنا۔ اور چوتھا قول یہ ہے کہ اس لفظ کا اطلاق محض رات کو اٹھنے پر نہیں ہوتا بلکہ سو کر اٹھنے پر ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ اور مجاہدؒ نے اسی چوتھے قول کو اختیار کیا ہے۔

ے اصل میں لفظ اَشَدُّ وَطْأً استعمال ہوا ہے جس کے معنی میں اتنی وسعت ہے کہ کسی ایک فقرے میں اسے ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ رات کو عبادت کے لیے اٹھنا اور دیر تک کھڑے رہنا چونکہ طبیعت کے خلاف ہے اور نفس اُس وقت آرام کا مطالبہ کرتا ہے، اس لیے یہ

تو تمہارے لیے بہت مصروفیات ہیں۔ اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو۹ اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو۔ وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، لہٰذا اسی کو اپنا وکیل بنا لو۱۰۔ اور جو باتیں لوگ بنا رہے ہیں ان پر صبر کرو اور شرافت کے ساتھ ان سے الگ

فعل ایک ایسا مجاہدہ ہے جو نفس کو دبانے اور اس پر قابو پانے کی بڑی زبردست تاثیر رکھتا ہے۔ اس طریقے سے جو شخص اپنے آپ پر قابو پالے اور اپنے جسم و ذہن پر تسلّط حاصل کر کے اپنی اس طاقت کو خدا کی راہ میں استعمال کرنے پر قادر ہو جائے وہ زیادہ مضبوطی کے ساتھ دینِ حق کی دعوت کو دنیا میں غالب کرنے کے لیے کام کر سکتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ دل اور زبان کے درمیان موافقت پیدا کرنے کا بڑا مؤثر ذریعہ ہے، کیونکہ رات کے ان اوقات میں بندے اور خدا کے درمیان کوئی دوسرا حائل نہیں ہوتا اور اس حالت میں آدمی جو کچھ زبان سے کہتا ہے وہ اس کے دل کی آواز ہوتی ہے۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ یہ آدمی کے ظاہر و باطن میں مطابقت پیدا کرنے کا بڑا کارگر ذریعہ ہے، کیونکہ رات کی تنہائی میں جو شخص اپنا آرام چھوڑ کر عبادت کے لیے اٹھے گا وہ لامحالہ اخلاص ہی کی بنا پر ایسا کرے گا، اس میں ریاکاری کا سرے سے کوئی موقع ہی نہیں ہے۔ چوتھا مطلب یہ ہے کہ یہ عبادت چونکہ دن کی عبادت کی بہ نسبت آدمی پر زیادہ گراں ہوتی ہے اس لیے اس کا التزام کرنے سے آدمی میں بڑی ثابت قدمی پیدا ہوتی ہے، وہ خدا کی راہ میں زیادہ مضبوطی کے ساتھ چل سکتا ہے اور اس راہ کی مشکلات کو زیادہ استقامت کے ساتھ برداشت کر سکتا ہے۔

۸؎ اصل میں اَقْوَمُ قِیْلاً ارشاد ہوا ہے جس کے لغوی معنی ہیں "قول کو زیادہ راست اور درست بناتا ہے"۔ لیکن مدعا یہ ہے کہ اُس وقت انسان قرآن کو زیادہ سکون و اطمینان اور توجہ کے ساتھ سمجھ کر پڑھ سکتا ہے۔ ابن عباسؓ اس کا مفہوم یہ بیان کرتے ہیں کہ اجدر ان یفقہ فی القرآن، یعنی "وہ اس کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ آدمی قرآن میں غور و خوض کرے" (ابو داؤد)۔

۹؎ دن کے اوقات کی مصروفیتوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ ارشاد کہ "اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو" خود بخود یہ مفہوم ظاہر کرتا ہے کہ دنیا میں ہر طرح کے کام کرتے ہوتے بھی اپنے رب کی یاد سے

ہو جاؤ۔[11] اِن جھٹلانے والے خوشحال لوگوں سے نمٹنے کا کام تم مجھ پر چھوڑ دو[12] اور انہیں ذرا کچھ دیر اِسی حالت پہ رہنے دو۔ ہمارے پاس (اِن کے لیے) بھاری بیڑیاں ہیں[13] اور بھڑکتی ہوئی

کبھی غافل نہ ہو اور کسی نہ کسی شکل میں اس کا ذکر کرتے رہو (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم۔ الاحزاب، حاشیہ ۶۳)

[10] وکیل اُس شخص کو کہتے ہیں جس پر اعتماد کر کے کوئی شخص اپنا معاملہ اُس کے سپرد کر دے۔ قریب قریب اِسی معنی میں ہم اُردو زبان میں وکیل کا لفظ اُس شخص کے لیے استعمال کرتے ہیں جس کے حوالہ اپنا مقدمہ کر کے ایک آدمی مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کی طرف سے وہ اچھی طرح مقدمہ لڑے گا اور اسے خود اپنا مقدمہ لڑنے کی حاجت نہ رہے گی۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اِس دین کی دعوت پیش کرنے پر تمہارے خلاف مخالفتوں کا جو طوفان اُٹھ کھڑا ہوا ہے اور جو مشکلات تمہیں پیش آ رہی ہیں اُن پر کوئی پریشانی تم کو لاحق نہ ہونی چاہیے۔ تمہارا رب وہ ہے جو مشرق و مغرب، یعنی ساری کائنات کا مالک ہے، جس کے سوا خدائی کے اختیارات کسی کے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ تم اپنا معاملہ اُسی کے حوالے کر دو اور مطمئن ہو جاؤ کہ اب تمہارا مقدمہ وہ لڑے گا، تمہارے مخالفین سے وہ نمٹے گا اور تمہارے سارے کام وہ بنائے گا۔

[11] الگ ہو جاؤ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان سے مقاطعہ کر کے اپنی تبلیغ بند کر دو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے منہ نہ لگو، ان کی بیہودگیوں کو بالکل نظر انداز کر دو، اور ان کی کسی بدتمیزی کا جواب نہ دو۔ پھر یہ احتراز بھی کسی غم اور غصے اور جھنجلاہٹ کے ساتھ نہ ہو، بلکہ اُس طرح کا احتراز ہو جس طرح ایک شریف آدمی کسی بازاری آدمی کی گالی سُن کر اسے نظر انداز کر دیتا ہے اور دل پر میل تک نہیں آنے دیتا۔ اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل کچھ اس سے مختلف تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو یہ ہدایت فرمائی۔ اصل میں تو آپ پہلے ہی سے اسی طریقے پر عمل فرما رہے تھے، لیکن قرآن میں یہ ہدایت اس لیے دی گئی کہ کفار کو بتا دیا جائے کہ تم جو حرکتیں کر رہے ہو ان کا جواب نہ دینے کی وجہ کمزوری نہیں ہے بلکہ اللہ نے ایسی باتوں کے جواب

آگ اور حلق میں پھنسنے والا کھانا اور دردناک عذاب۔ یہ اُس دن ہوگا جب زمین اور پہاڑ لرز اٹھیں گے اور پہاڑوں کا حال ایسا ہو جائے گا جیسے ریت کے ڈھیر ہیں جو بکھرے جا رہے ہیں ۱۴ تم ۱۵ لوگوں کے پاس ہم نے اُسی طرح ایک رسول تم پر گواہ بنا کر بھیجا ہے ۱۶ جس طرح ہم نے فرعون

ہیں اپنے رسول کو یہی شریفانہ طریقہ اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے۔

۱۲ ان الفاظ میں صاف اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ مکہ میں دراصل جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلا رہے تھے اور طرح طرح کے فریب دیکر اور تعصبات اُبھار کر عوام کو آپ کی مخالفت پر آمادہ کر رہے تھے وہ قوم کے کھاتے پیتے، پیٹ بھرے، خوشحال لوگ تھے، کیونکہ انہی کے مفاد پر اسلام کی اس دعوت اصلاح کی زد پڑ رہی تھی۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہ معاملہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ خاص نہ تھا بلکہ ہمیشہ یہی گروہ اصلاح کی راہ روکنے کے لیے سنگِ گراں بن کر کھڑا ہوتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو الاعراف، آیات ۶۰-۶۶-۷۵-۸۸۔ المومنون، ۳۳۔ سبا، ۳۴-۳۵۔ الزُّخرُف، ۲۳-

۱۳ جہنم میں بھاری بیڑیاں مجرموں کے پاؤں میں اس لیے نہیں ڈالی جائیں گی کہ وہ بھاگ نہ سکیں، بلکہ اس لیے ڈالی جائیں گی کہ وہ اٹھ نہ سکیں۔ یہ فرار سے روکنے کے لیے نہیں بلکہ عذاب کے لیے ہونگی۔

۱۴ چونکہ اُس وقت پہاڑوں کے اجزاء کو باندھ کر رکھنے والی کشش ختم ہو جائے گی، اس لیے پہلے تو وہ باریک بُھربُھری ریت کے ٹیلے بن جائیں گے، پھر جو زلزلہ زمین کو ہلا رہا ہوگا اس کی وجہ سے یہ ریت بکھر جائے گی اور ساری زمین ایک چٹیل میدان بن جائے گی۔ اسی آخری کیفیت کو سُورۂ طٰہٰ آیات ۱۰۵ تا ۱۰۷ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ "لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ ان پہاڑوں کا کیا بنے گا۔ کہو، میرا رب ان کو دھول بنا کر اڑا دے گا اور زمین کو ایسا ہموار چٹیل میدان بنا دے گا کہ اس میں تم کوئی بل اور سلوٹ نہ دیکھو گے۔"

۱۵ اب مکہ کے اُن کُفّار کو خطاب کیا جا رہا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلا رہے تھے اور آپ کی مخالفت میں سرگرم تھے۔

۱۶ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں پر گواہ بنا کر بھیجنے کا مطلب یہ بھی ہے کہ آپ دنیا میں اُن کے سامنے اپنے قول اور عمل سے حق کی شہادت دیں، اور یہ بھی کہ آخرت میں جب اللہ تعالیٰ کی عدالت برپا ہوگی، اُس وقت آپ یہ گواہی دیں کہ مَیں نے ان لوگوں کے سامنے حق پیش کر دیا تھا (مزید تشریح کے

کی طرف ایک رسول بھیجا تھا۔ (پھر دیکھ لو کہ جب) فرعون نے اُس رسول کی بات نہ مانی تو ہم نے اُس کو بڑی سختی کے ساتھ پکڑ لیا۔ اگر تم ماننے سے انکار کرو گے تو اُس دن کیسے بچ جاؤ گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا[۱۷] اور جس کی سختی سے آسمان پھٹا جا رہا ہو گا؟ اللہ کا وعدہ تو پورا ہو کر ہی رہنا ہے۔ یہ ایک نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کر لے۔ ع۱

اے نبی[۱۸]، تمہارا رب جانتا ہے کہ تم کبھی دو تہائی رات کے قریب اور کبھی آدھی رات اور

لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، البقرہ، حاشیہ ۱۴۴۔ النساء، حاشیہ ۶۴۔ جلد دوم، النحل، آیات ۸۴ و ۸۹ جلد چہارم، الاحزاب، حاشیہ ۸۲۔ جلد پنجم، الفتح، حاشیہ ۱۴)۔

[۱۷] یعنی اول تو تمہیں ڈرنا چاہیے کہ اگر ہمارے بھیجے ہوئے رسول کی بات تم نے نہ مانی تو وہ بُرا انجام تمہیں دُنیا ہی میں دیکھنا ہو گا جو فرعون اس سے پہلے اسی جرم کے نتیجے میں دیکھ چکا ہے۔ لیکن اگر فرض کرو کہ دنیا میں تم پر کوئی عذاب نہ بھی بھیجا گیا تو روزِ قیامت کے عذاب سے کیسے بچ نکلو گے؟

[۱۸] یہ آیت جس کے اندر نمازِ تہجد کے حکم میں تخفیف کی گئی ہے، اس کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ حضرت عائشہؓ سے مسند احمد، مسلم اور ابو داؤد میں یہ روایت منقول ہے کہ پہلے حکم کے بعد یہ دوسرا حکم ایک سال کے بعد نازل ہوا اور رات کا قیام فرض سے نفل کر دیا گیا۔ دوسری روایت حضرت عائشہؓ ہی سے ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے یہ نقل کی ہے کہ یہ حکم پہلے حکم کے ۸ مہینہ بعد آیا تھا، اور ایک تیسری روایت جو ابن ابی حاتم نے انہی سے نقل کی ہے اس میں سولہ مہینے بیان کیے گئے ہیں۔ ابو داؤد، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباس سے ایک سال کی مدت نقل کی ہے۔ لیکن حضرت سعید بن جُبیر کا بیان ہے کہ اس کا نزول دس سال بعد ہوا ہے (ابن جریر و ابن ابی حاتم)۔ ہمارے نزدیک یہی قول زیادہ صحیح ہے اس لیے کہ پہلے رکوع کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ وہ مکہ معظمہ میں نازل ہوا ہے اور وہاں بھی اُس کا نزول ابتدائی دور میں ہوا ہے جبکہ حضورؐ کی نبوت کا آغاز ہونے پر زیادہ سے زیادہ چار سال گزرے ہوں گے بخلاف اس کے یہ دوسرا رکوع اپنے مضامین کی صریح شہادت کے مطابق مدینہ کا نازل شدہ معلوم ہوتا ہے جب کفار سے جنگ کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور زکوٰۃ کی فرضیت کا حکم بھی آ چکا تھا۔ اس بنا پر لامحالہ ان دونوں رکوعوں کے زمانۂ نزول میں کم از کم دس سال کا فاصلہ ہی ہونا چاہیے۔

کبھی ایک تہائی رات عبادت میں کھڑے رہتے ہو۱۹؎، اور تمہارے ساتھیوں میں سے بھی ایک گروہ یہ عمل کرتا ہے۲۰؎۔ اللہ ہی رات اور دن کے اوقات کا حساب رکھتا ہے، اُسے معلوم ہے کہ تم لوگ اوقات کا ٹھیک شمار نہیں کر سکتے، لہٰذا اس نے تم پر مہربانی فرمائی، اب جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو پڑھ لیا کرو۲۱؎۔ اُسے معلوم ہے کہ تم میں کچھ مریض ہوں گے، کچھ دوسرے لوگ اللہ کے فضل کی تلاش میں سفر کرتے ہیں۲۲؎، اور کچھ اور لوگ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۲۳؎۔ پس جتنا قرآن بآسانی پڑھا جا سکے پڑھ

۱۹؎ اگرچہ ابتدائی حکم آدھی رات یا اس سے کچھ کم و بیش کھڑے رہنے کا تھا، لیکن چونکہ نماز کی محویت میں وقت کا اندازہ نہ رہتا تھا، اور گھڑیاں بھی موجود نہ تھیں کہ اوقات ٹھیک ٹھیک معلوم ہو سکیں، اس لیے کبھی دو تہائی رات تک عبادت میں گزر جاتی تھی اور کبھی یہ مدت گھٹ کر ایک تہائی رہ جاتی تھی۔

۲۰؎ ابتدائی حکم میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو خطاب کیا گیا تھا، اور آپ ہی کو قیام لیل کی ہدایت فرمائی گئی تھی، لیکن مسلمانوں میں اُس وقت حضورؐ کے اتباع اور نیکیاں کمانے کا جو غیر معمولی جذبہ پایا جاتا تھا اس کی بنا پر اکثر صحابۂ کرام بھی اس نماز کا اہتمام کرتے تھے۔

۲۱؎ چونکہ نماز میں طول زیادہ تر قرآن کی طویل قرأت ہی سے ہوتا ہے، اس لیے فرمایا کہ تہجد کی نماز میں جتنا قرآن بسہولت پڑھ سکو پڑھ لیا کرو، اس سے نماز کی طوالت میں آپ سے آپ تخفیف ہو جائے گی۔ اس ارشاد کے الفاظ اگرچہ بظاہر حکم کے ہیں، لیکن یہ امر متفق علیہ ہے کہ تہجد فرض نہیں بلکہ نفل ہے۔ حدیث میں بھی صراحت ہے کہ ایک شخص کے پوچھنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم پر دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض ہیں۔ اس نے پوچھا، کیا اس کے سوا بھی کوئی چیز مجھ پر لازم ہے۔ جواب میں ارشاد ہوا "نہیں، الا یہ کہ تم اپنی خوشی سے کچھ پڑھو" (بخاری و مسلم)۔

اِس آیت سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ نماز میں جس طرح رکوع و سجدہ فرض ہے اسی طرح قرآن مجید کی قرأت بھی فرض ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح دوسرے مقامات پر رکوع یا سجود کے الفاظ استعمال کر کے نماز مراد لی ہے، اسی طرح یہاں قرآن کی قرأت کا ذکر کیا ہے اور مراد اس سے نماز میں قرآن پڑھنا ہے۔ اس استنباط پر اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ جب نماز تہجد خود نفل ہے تو اس میں قرآن پڑھنا کیسے فرض ہو سکتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ نفل نماز بھی جب آدمی پڑھے تو اس میں نماز کی تمام شرائط پوری کرنا اور اس کے تمام ارکان و فرائض ادا کرنا لازم ہوتا ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ نفل نماز کے لیے کپڑوں کی طہارت

لیا کرو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو[۲۴] اور اللہ کو اچھا قرض دیتے رہو[۲۵]۔ جو کچھ بھلائی تم اپنے لیے آگے بھیجو گے اسے اللہ کے ہاں موجود پاؤ گے، وہی زیادہ بہتر ہے اور اس کا اجر بہت بڑا ہے[۲۶]۔ اللہ سے مغفرت

جسم کا پاک ہونا، وضو کرنا، اور ستر چھپانا واجب نہیں ہے اور اس میں قیام و قعود اور رکوع و سجود بھی نفل ہی ہیں۔

۲۲؎ جائز اور حلال طریقوں سے رزق کمانے کے لیے سفر کرنے کو قرآن مجید میں جگہ جگہ اللہ کا فضل تلاش کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۲۳؎ یہاں اللہ تعالیٰ نے پاک رزق کی تلاش اور جہاد فی سبیل اللہ کا ذکر جس طرح ایک ساتھ کیا ہے اور بیماری کی مجبوری کے علاوہ ان دونوں کاموں کو نماز تہجد سے معافی یا اس میں تخفیف کا سبب قرار دیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں جائز طریقوں سے روزی کمانے کی کتنی بڑی فضیلت ہے۔ حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ما من جالب یجلب طعاماً الی بلدٍ من بلدان المسلمین فیبیعه لسعر یومه الا کانت منزلته عند اللہ ثم قرأ رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وآخرون یضربون فی الارض ... "جو شخص مسلمانوں کے کسی شہر میں غلہ لے کر آیا اور اُس روز کے بھاؤ پر اسے بیچ دیا اس کو اللہ کا قرب نصیب ہوگا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی آیت پڑھی" (ابن مردویہ)۔ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ فرمایا ما من حال یاتینی علیه الموت بعد الجهاد فی سبیل اللہ احبّ الیّ من ان یاتینی وانا بین شعبتی جبل التمس من فضل اللہ وقرأ هذه الآیة۔ "جہاد فی سبیل اللہ کے بعد اگر کسی حالت میں جان دینا مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے تو وہ یہ حالت ہے کہ میں اللہ کا فضل تلاش کرتے ہوئے کسی پہاڑی درے سے گزر رہا ہوں اور وہاں مجھ کو موت آجائے، پھر انہوں نے یہی آیت پڑھی" (بیہقی فی شعب الایمان)۔

۲۴؎ مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ اس سے مراد پنج وقتہ فرض نماز اور فرض زکوٰۃ ادا کرنا ہے۔

۲۵؎ ابن زید کہتے ہیں کہ اس سے مراد زکوٰۃ کے علاوہ اپنا مال خدا کی راہ میں صرف کرنا ہے، خواہ وہ جہاد فی سبیل اللہ ہو، یا بندگانِ خدا کی مدد ہو، یا رفاہِ عام ہو، یا دوسرے بھلائی کے کام۔ اللہ کو قرض دینے اور اچھا قرض دینے کے مطلب کی تشریح ہم اس سے پہلے متعدد مقامات پر کر چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، البقرہ، حاشیہ ۲۶۷۔ المائدہ، حاشیہ ۳۳ جلد پنجم، الحدید، حاشیہ ۱۶۔

مانگتے رہو، بے شک اللہ بڑا غفور و رحیم ہے ؏ ع

۲۶؎ مطلب یہ ہے کہ تم نے آگے اپنی آخرت کے لیے جو کچھ بھیج دیا وہ تمہارے لیے اُس سے زیادہ نافع ہے جو تم نے دنیا ہی میں روک رکھا اور کسی بھلائی کے کام میں اللہ کی رضا کی خاطر خرچ نہ کیا۔ حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ایکم مالہ احب الیہ من مال وارثہ؟ "تم میں سے کون ہے جس کو اپنا مال اپنے وارث کے مال سے زیادہ محبوب ہے؟" لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جسے اپنا مال اپنے وارث کے مال سے زیادہ محبوب نہ ہو۔ فرمایا اعلموا ما تقولون "سوچ لو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہمارا حال واقعی یہی ہے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: انما مال احدکم ما قدم و مال وارثہ ما اخّر۔ "تمہارا اپنا مال تو وہ ہے جو تم نے اپنی آخرت کے لیے آگے بھیج دیا۔ اور جو کچھ تم نے روک کر رکھا وہ تو وارث کا مال ہے۔" (بخاری۔ نسائی۔ مسند ابو یعلیٰ)

فقر و فاقہ اور اس کا اسلامی حل

شیخ یوسف قرضاوی

تلخیص و ترجمہ: عبدالحمید صدیقی

(۳)

اسلام سرمایہ دارانہ طرزِ فکر کا مخالف ہے | اسلام جس طرح فقر و فاقہ کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے صرف انفرادی احسان پر انحصار کرنے کی تائید نہیں کرتا اسی طرح سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر کی بھی حمایت نہیں کرتا۔ وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ کوئی دولتمند آدمی اپنے مال و دولت کا حقیقی مالک اور اپنے مال کے تصرّف میں مختارِ کل ہے، چاہے تو خدا کی راہ میں دے اور چاہے تو بخل سے کام لے، یا اپنی خواہشاتِ نفسانی کی تکمیل کے لیے بے جا طور پر خرچ کرتا رہے۔ یہ مطلقاً سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر بلکہ موزوں ترین الفاظ میں اُس قارون کا نقطۂ نظر ہے جو اپنی مالداری کو اپنا کمال کہتا تھا اور خدا تعالیٰ کی نعمت کا منکر تھا اور اپنے اہلِ قوم کا حق مار لیتا تھا۔ اسی پاداش میں اللہ رب العزت نے اُسے اور اس کے گھر بار کو زمین میں دھنسا دیا تھا۔ سورۂ قصص میں ارشادِ خداوندی ہے:

فَخَسَفْنَا بِهِ وَبِدَارِهِ الْأَرْضَ فَمَا كَانَ لَهُ مِن فِئَةٍ يَنصُرُونَهُ مِن دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنتَصِرِينَ۔ (سورۃ القصص-۸۱)

آخر کار ہم نے اُسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا پھر کوئی اس کے حامیوں کا گروہ نہ تھا جو اللہ کے مقابلے میں اس کی مدد کو آتا اور نہ وہ خود اپنی مدد آپ کر سکا۔

اسلام کا نقطۂ نظر دولت کے بارے میں یہ ہے کہ مال کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے اور دولتمند شخص مال کے قبضہ و تصرّف میں اس کا امین ہے جسے تصرفِ مال کے بارے میں ہر وقت مال کے حقیقی مالک کی مرضی و منشا کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَأَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُم مُّسْتَخْلَفِينَ

اور خرچ کرو اس مال میں سے جس میں اُس نے تم کو

فِيهِ (الحدید: ۷) اگلوں کا جانشین بنایا ہے

وَآتُوهُمْ مِنْ مَالِ اللَّهِ الَّذِي آتَاكُمْ ۔ (النور: ۳۳) اور ان کو اس مال میں سے دو جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہے۔

أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ (البقرہ: ۲۵۴) جو کچھ مال متاع ہم نے تم کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرو۔

زکوٰۃ کا اسلامی قانون اللہ تعالیٰ چونکہ مال کا حقیقی مالک ہے لہٰذا وہ دولتمندوں پر واجب قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے مال و دولت میں غرباء و مساکین کا ایک مقررہ حق رکھیں۔ اس معاملہ میں اسلام صرف وعظ و تلقین اور ترغیب و ترہیب ہی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ اسلامی حکومت کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ دولتمندوں سے اللہ کا مقرر کردہ حق لے کر غرباء و مساکین کو دے اور جو اس قانونِ الٰہی سے سرتابی کرے اُس سے جنگ کی جائے تا آنکہ وہ چار و ناچار حق کے آگے جھک جائے۔ یُوں اسلام وعظ و تلقین کے ساتھ حکومت اور قانون کا دباؤ بھی استعمال کرتا ہے، جبکہ انفرادی احسان کے قائلین صرف وعظ و تلقین ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

اس قانون کی امتیازی خوبیاں فقر و فاقہ کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے اسلام کی یہی وہ خوبی ہے جو اُسے دوسرے نئے ازموں کے نقطہ ہائے نظر سے ممتاز کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اسلام کے نقطۂ نظر کی مندرجۂ ذیل خوبیاں بھی کسی دوسرے نقطۂ نظر میں نہیں پائی جاتیں

۱۔ **اسبقیتِ زمانی**: اسلام نے چودہ سو سال سے فقراء و مساکین کے حقوق کو تسلیم کیا ہے اور اُن کے حصول کے لیے برسرِ پیکار رہا ہے۔ کہاوت ہے کہ قابلِ تعریف وہی ہوتا ہے جس نے کسی نیک کام کا آغاز کیا ہو۔

۲۔ **ثبات و دوام**: انسان کے بنائے ہوئے نظاموں میں کئی قانون ہنگامی حالات کے تحت داخل کر لیے جاتے ہیں اور حالات بدل جانے پر انہیں خارج بھی کیا جا سکتا ہے۔ مگر جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہمیشہ رہنے والا قانون ہے، حرفِ آخر ہے، اٹل اور ناقابلِ تغیر ہے۔

۳۔ **جامعیت**: یہ خوبی صرف اُسی نظام میں پائی جا سکتی ہے جسے اُس ذات نے بنایا ہو جو انسان اور کائنات سے پوری طرح واقف ہو اور اُن کی تخلیق کی حکمت سے بھی آگاہ ہو۔ اور یہ اُسی نظام

میں پائی جا سکتی ہے جو انسانی کمزوریوں اور خواہشات سے مبرا ہو کیونکہ انسانی خواہشات مختلف امور میں انسان کے فیصلوں پر اثر انداز ہو جاتی ہیں۔

۴۔ اصالت: اسلام نے فقراء و مساکین کے جو حقوق مقرر کیے ہیں اور اُن کے لیے جو قوانین بنائے ہیں وہ کسی خاص قسم کے حالات، انقلابات اور لڑائیوں کے دباؤ کے تحت نہیں بنائے گئے بلکہ وہ اسلام کے اساسی اور بنیادی قوانین ہیں۔

انشورنس کا جو طریقہ دورِ حاضر میں رائج ہے وہ اس بنیاد پر قائم ہے کہ پالیسی ہولڈروں کو اُن کی ادا کردہ قسطوں کی نسبت سے معاوضہ دیا جائے نہ کہ اُن کی حقیقی ضروریاتِ زندگی کا لحاظ رکھتے ہوئے۔ یعنی جو زیادہ رقم ادا کرے گا اُسے زیادہ حصہ ملے گا اور جو کم ادا کرے گا اس کا حصہ بھی اُسی نسبت سے کم ہو گا خواہ اس کی ضروریات کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں۔ اس کے برعکس اسلام جس اجتماعی انشورنس کا قائل ہے وہ یہ ہے کہ کسی ضرورت مند کو اتنا حصہ دیا جائے جس سے اس کی ضروریات پوری ہو جائیں اور اُس کی تکلیف و تنگی دُور ہو جائے۔

اسی طرح مغربی ممالک میں سوشل سکیورٹی کی مروجہ اسکیم بھی فقر و فاقہ کے مسئلہ کو حل کرنے سے قاصر ہے۔ اُس کی دو وجہیں ہیں۔

۱۔ اس میں وہ جامعیت نہیں کہ معاشرے کے سارے محتاج و تنگ دست افراد کو تحفظ کی ضمانت دے سکے۔

۲۔ یہ محتاج و تنگ دست افراد کی پوری طرح کفالت کرنے سے بھی قاصر ہے۔ اس کے برعکس اسلام کا ایک نظامِ زکوٰۃ ہے جو معاشرے کے سارے غرباء و مساکین کی کفالت باحسن وجوہ کر سکتا ہے۔

اسلامی اور اشتراکی نقطۂ نظر کا اختلاف: اسلام جس طرح فقر و فاقہ کے بارے میں رہبانیت، جبریہ، انفرادی احسان کے قائلین اور سرمایہ داروں کے نقطہ ہائے نظر کی تردید کرتا ہے اسی طرح مارکسی اشتراکیت کی بھی پُر زور تردید کرتا ہے۔ اشتراکیت پسند گروہ کے نزدیک فقر و فاقہ کے مسئلے کا حل یہ ہے کہ دولتمند طبقے کو بالکل ختم کر دیا جائے اور اُن کے مال و متاع کو ضبط کر لیا جائے اور قانونِ ملکیت کو بالکل کالعدم قرار دیا جائے۔ غریب طبقے کو دولتمند طبقے کے خلاف بھڑکا کر طبقاتی کشمکش کو ختم دیا جائے۔

حتیٰ کہ مزدوروں اور محنت کاروں کے طبقے غالب آجائیں اور ایک پرولتاری ڈکٹیٹر شپ قائم ہو جائے۔

۱۔ اسلام ان سب باتوں کی پرزور تردید کرتا ہے کیونکہ یہ اسلام کے اصولوں سے قطعی طور پر ٹکراتی ہیں۔ دولتمند طبقے کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر کچھ دولتمند ایسے ہیں جنہیں اُن کی دولتمندی نے سرکشی اور بغاوت پہ آمادہ کر دیا ہے اور وہ دوسروں کو اپنے ظلم وجور کا نشانہ بناتے ہیں اور کمزوروں اور محتاجوں کے حقوق غصب کر جاتے ہیں تو دولتمند طبقے ہی میں اللہ کے ایسے نیک بندے بھی ہیں جو دولتمندی کی نعمت سے متمتع ہو کر خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اور اپنے مال میں سے اللہ اور بندوں کا حق بھی ادا کرتے ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے کسی طبقے کے چند افراد کے جرم کی سزا اس طبقے کے سارے افراد کو نہیں دی جا سکتی، کیونکہ ہر شخص اپنے اعمال کے بارے میں خود جواب دہ ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ (طور: ۲۱)	ہر شخص اپنے کسب کے عوض رہن ہے۔
وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ۔ (انعام: ۱۶۴)	ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

بلکہ قرآن مجید نے تو یہ بھی فرمایا ہے کہ اس اصول کو پہلے ادیان میں بھی تسلیم کیا گیا ہے:

أَمْ لَمْ يُنَبَّأْ بِمَا فِي صُحُفِ مُوسَىٰ وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّىٰ أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (النجم ۳۶-۳۹)	کیا اُسے ان باتوں کی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ اور ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں بیان ہوئی ہیں جس نے وفا کا حق ادا کر دیا؟ یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اُس نے سعی کی ہے۔

اسلام ذاتی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے، کیونکہ اس میں انسان کے ایک فطری جذبہ کی تسکین کا سامان ہے۔ اور اس میں معاشرتی پیش رفت اور اقتصادی ترقی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ نیز یہ تمدنی اور سیاسی آزادی کے بقا کی مادی ضمانت ہے۔ اس نے ذاتی ملکیت کو کچھ حدود و قیود کا ضرور پابند بنایا ہے، مگر وہ عام طور پر ذاتی ملکیت کے اصول کو استحسان کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور مختلف قوانین واحکام کے ذریعے اُس کی حفاظت کرتا ہے اور

اس کو اپنے اقتصادی نظام کی بنیاد قرار دیتا ہے۔

ذاتی ملکیت کے اصول میں کوئی خرابی نہیں بلکہ خرابی تو اُن لوگوں کے اپنے اندر ہے جو اپنی ذاتی ملکیت کو بڑھانے کے لیے دوسرے لوگوں کا استحصال کرتے ہیں۔ اگر وہ لوگ ظلم و جور سے باز آجائیں تو یہی دولت اُن کے ہاتھوں میں خیر و اصلاح کا ایک ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ۔ (وہ حلال طریقے سے کمایا ہُوا مال کتنا اچھا ہے جو کسی نیک آدمی کے پاس ہو) لہٰذا اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان کے قلب و ضمیر کی اصلاح کی جائے۔ وہ اس مقصد کے حصول کے لیے صرف وعظ و تلقین ہی نہیں کرتا بلکہ انسان کو قانون کا پابند بنا کر اُس پر حکومت کی نگرانی بھی ضروری قرار دیتا ہے۔

اسلام افراد اور معاشرے کے باہمی تعلقات کو اخوت و تعاون کی بنیاد پر استوار کرتا ہے اور سوسائٹی کے مختلف افراد کی باہمی دشمنیوں اور مختلف طبقات کی باہمی کشمکش کو برقرار نہیں رکھتا، بلکہ کینہ، حسد اور بُغض کو ایسی آفات قرار دیتا ہے جو نیک اعمال کو اس طرح کھا جاتی ہیں جس طرح آگ ایندھن کو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حسد و بُغض کو اس کے خطرناک اور تباہ کُن اثرات کے پیشِ نظر دَاءُ الْاُمَمِ (امتوں کا مرض) قرار دیا ہے۔

اسلام ہر اُس ازم کی شدت سے تردید کرتا ہے جو اُمراء و فقراء کی باہمی کشمکش کو ہوا دیتا ہے۔ اسلام میں اخوت ایمان و اسلام کے شجرِ پُربہار کا شیریں پھل ہے۔ قرآنِ مجید کے ارشاد اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں) اور فرمانِ نبویؐ کُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا (اے بندگانِ خدا آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ) کے مطابق سارے مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ چنانچہ عبدالرحمان بن عوفؓ اور عثمانؓ بن عفان وغیرہ دولتمند صحابہ ابوہریرہؓ، ابوذرؓ اور بلالؓ وغیرہ غریب صحابہ ایک دوسرے کے رفیق تھے۔ کوئی غریب کسی امیر سے کینہ نہیں رکھتا تھا اور کوئی امیر کسی غریب پر اپنی برتری نہیں جتاتا تھا۔ وہ آغوشِ اسلام میں آکر آپس میں بھائی بھائی بن گئے تھے۔

اسلام کسی مسئلے کا کوئی ایسا حل قبول نہیں کرتا جو اور بہت سے خطرناک تر مسائل کو پیدا کر دے۔ کمیونسٹ اور سوشلسٹ فقر و فاقہ کے مسئلے اور اقتصادی خرابیوں کا یہ حل پیش کرتے ہیں کہ ساری قوم کی

آزادی سلب کرکے اُسے ایک ایسی جابر و ظالم ڈکٹیٹر شپ کے چنگل میں دے دیا جائے جو اُن کے رزق اور دیگر ضروریاتِ زندگی پر پُوری طرح قابض ہو اور کسی کے لیے اس بات کا موقع نہ چھوڑے کہ وہ اپنی مرضی سے کوئی کام کرکے دولت کمائے اور اپنے حسبِ منشا اس میں تصرّف کر سکے۔ بالفاظِ دیگر اس کا مطلب یہ ہے کہ سارے باشندگانِ ملک کو ایک ہی رشتۂ غلامی میں منسلک کر دیا جائے، سب کے سب ایک ہی آقا کے تابع فرمان بن کے رہ جائیں اور اس آقائی پر وہ گروہ فائز ہو جو پولیس، جاسوسی نظام اور جیلوں وغیرہ کی مدد سے اقتدار پر قابض ہو گیا ہو اور لوگ اُس کے جبر و تشدد کے آگے بالکل بے بس ہوں۔ بلکہ اُس کے ہر اچھے بُرے عمل پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسانے پر مجبور ہوں اور لفظ "نہیں" کہنا تو درکنار وہ حاکم گروہ کے کسی ناجائز حکم پر "کیوں" کہنے سے بھی بالکل عاجز ہوں۔ وہ اس کی بات کاٹ بھی کیسے سکتے ہیں جبکہ اُس کے قبضے میں اُن کا اور اُن کی اولاد کا رزق ہو اور اُن کے اپنے قبضے میں کچھ بھی نہ ہو۔

باوجود اس کے کہ کمیونسٹ اور سوشلسٹ قوم کی آزادی سلب کرکے اُن پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتے ہیں اور لوگوں کی املاک اور پیداوار کے وسائل پر قبضہ کر لیتے ہیں، وہ فقر و فاقہ کے مسئلے کو حل نہیں کر سکتے۔ اقوامِ متحدہ کے دفترِ شماریات نے چند سال ہوئے مختلف ممالک میں ایک فرد کی سالانہ اوسط آمدنی کا نقشہ یوں پیش کیا تھا جسے ہم ایک عربی پروفیسر ماہر نسیم کی کتاب "النظام الشیوعی" سے نقل کر رہے ہیں:

ریاستہائے متحدہ امریکہ	۱۴۵۳ ڈالر	ہالینڈ	۵۰۲ ڈالر
سوئٹزرلینڈ	۸۴۹ ڈالر	فرانس	۴۸۲ "
سویڈن	۷۸۰ "	چیکوسلواکیا	۳۷۱ "
برطانیہ	۷۷۳ "	روس	۳۰۸ "
ڈنمارک	۶۸۹ "	پولینڈ	۳۰۰ "
آسٹریلیا	۶۷۹ "	ہنگری	۲۶۹ "
بیلجیم	۵۸۲ "	چین	۲۷ "

اشتراکی ممالک میں سالانہ اوسط آمدنی کے معیار کی یہ پستی جو مذکورہ بالا نقشہ سے ظاہر ہے اس کا باعث

وسائلِ پیداوار کے غلط استعمال کو قرار نہیں جا سکتا بلکہ اس کا سبب وہ نظام ہے جو ذاتی ملکیت پر قدغن لگاتا ہے، انفرادی صلاحیتوں کو کچل ڈالتا ہے اور فرد کی آرزوؤں اور جذبات کو دبا دیتا ہے۔ جس کے تحت فرد کی کوئی قدر و قیمت نہیں، نہ اُسے کمانے اور خرچ کرنے کی کوئی آزادی ہے۔ ایک بالکل آزادانہ نظامِ زندگی کے مقابلے میں اس پابند اور مختلف قیود و حدود سے مقیّد و محدود نظامِ زندگی کے دوسرے مروّجہ نظامہائے زندگی سے پیچھے رہ جانے کا اعتراف خود کمیونسٹ لیڈر بھی کر چکے ہیں۔ چنانچہ وہ اس نظام سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ دن بدن اشتراکیت سے دُور اور اُن نظاموں سے قریب تر ہو رہے ہیں جنہیں وہ ناپسند کرتے تھے۔

آخری بات یہ ہے کہ مارکسیت اپنی توجہ کا مرکز معاشرے کے اُن غریب، نادار اور عاجز لوگوں کو نہیں بناتی جو درحقیقت نگہداشت اور مدد کے محتاج ہیں وہ تو اپنی ساری توجہ پرولتاری طبقہ یعنی مزدور اور کسانوں پر مرکوز کر دیتی ہے تاکہ سوسائٹی کے نظام کو بدلنے اور دوسرے تمام طبقوں کو ختم کرنے کے لیے انہیں اپنا آلۂ کار بنا سکے۔ مگر مارکسی سوسائٹی جس میں ہر فرد کو اُس کے کام کے مطابق معاوضہ دیا جاتا ہے، اُس میں ناداروں، بیواؤں، بوڑھوں اور بیماروں کو کون پوچھے گا؟ کیونکہ مارکسیت کا سارا فلسفہ اس اصول کے گرد گھومتا ہے کہ "جو کام نہیں کرتا وہ کھائے بھی نہیں"۔

فقر و فاقہ کا مسئلہ حل کرنے کے لیے اسلام کے وسائل | اسلام نے فقر و فاقہ کے خلاف باقاعدہ جہاد کا اعلان کیا ہے اور اس کو ختم کرنے کے لیے ہر وقت مستعد رہتا ہے مبادا کہ وہ انسان کے عقیدہ، اخلاق کردار، عائلی زندگی اور اجتماعی زندگی پر اثر انداز ہو کر کوئی خطرناک صورتِ حال پیدا کر دے۔ اسی لیے اسلام نے یہ بات لازمی قرار دی ہے کہ معاشرے کے ہر فرد کو کم از کم مندرجۂ ذیل ضروریاتِ زندگی میسر ہونی چاہییں: خورد و نوش، رہائش، گرمیوں اور سردیوں کا لباس، اگر وہ کسی فن میں مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اُس فن کی وہ کتابیں وغیرہ جن کی اس کو ضرورت ہو، اگر وہ کوئی دستی کام کرتا ہے تو اُس کام کے ہتھیار و اوزار، اور اگر وہ شادی کا خواہشمند ہو تو اس کی شادی کا انتظام۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ معاشرے کے ہر فرد کو اُس کے مناسبِ حال وہ معیارِ زندگی میسّر آ سکے جو اللہ کے فرائض کی ادائیگی اور زندگی

کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں اس کے لیے ممد و معاون ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں معیشت کا یہ معیار ہر انسان کو کیسے حاصل ہو؟ اور اسلام نے اس سلسلے میں کونسے ذرائع و وسائل اختیار کیے ہیں؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اسلام نے انسان کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے مندرجۂ ذیل وسائل اختیار کیے ہیں۔

۱۔ عمل (کام کرنا) اسلامی سوسائٹی میں ہر فرد سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی کام کرے اور اُسے یہ حکم ہے کہ وہ روئے زمین پر چلے پھرے اور اللہ کا دیا ہوا رزق کھائے۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ۔ (الملک: ۱۵)	وہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو نرم بنا دیا پس چلو تم اس کے اطراف میں اور کھاؤ خدا کے رزق میں سے۔

کام، فقر و فاقہ سے نمٹنے کے لیے پہلا ہتھیار ہے، حصول مال کے لیے پہلا ذریعہ ہے، اور اُس زمین کو آباد کرنے کے لیے بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی خلافت کا شرف بخشا ہے اور اس کو حکم دیا ہے کہ زمین کو آباد کرے۔ ارشادِ خداوندی ہے صالح علیہ السلام اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ هُوَ أَنشَأَكُم مِّنَ الْأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا (ہود: ۶۱)	اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہی ہے جس نے زمین سے تم کو پیدا کیا اور یہاں تم کو بسایا ہے۔

اسلام نے ہر مسلمان کے لیے ہر کام کے دروازے کھلے رکھے ہیں۔ ہر شخص جس کام کی صلاحیت رکھتا ہو وہ اُسے اختیار کر سکتا ہے۔ کوئی متعین کام کرنا اُس پر فرض نہیں اِلّا یہ کہ سوسائٹی کی بہتری کے لیے اس کے سپرد کوئی خاص کام کر دیا جائے۔ البتہ اسلام اُن پیشوں کے اختیار کرنے سے روکتا ہے جو فرد اور معاشرے دونوں کے لیے ضرر رساں ہوں۔

اسلامی نظام کے زیرِ سایہ رہ کر کوئی محنت کرنے والا اپنی محنت کے معاوضے اور کوشش کے ثمرے سے

محروم نہیں رکھا جاتا بلکہ مزدور کی مزدوری اُس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ہی بلا کم و کاست ادا کر دی جاتی ہے۔ کیونکہ اگر اُسے وہ مزدوری نہیں دی جائے گی جس کا کہ وہ مستحق ہے تو یہ اُس پر ظلم ہوگا اور ظلم کو اسلام میں بالکل حرام قرار دیا گیا ہے۔

اسلامی نظام میں اس بات پر بھی کوئی قدغن نہیں کہ کسی محنت کار کے پاس حلال طریقے سے کمائی ہوئی اتنی دولت جمع ہو جائے جس سے وہ کوئی منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد خرید سکے اور اپنے معیارِ زندگی کو بلند کر سکے یا اُس سے بیماری اور بڑھاپے کے ایام میں فائدہ اٹھا سکے یا اس کی اولاد اور ورثاء اس کے مرنے کے بعد اُس سے متمتع ہو سکیں۔

اسلام نے اُن تمام نفسیاتی اسباب اور عملی رکاوٹوں پر بحث کی ہے جو لوگوں کو جہد و عمل سے روکتی ہیں:

(۱) توکل علی اللہ کا دعویٰ: بعض لوگ توکل علی اللہ کا دعویٰ کر کے جہد و عمل سے بالکل فارغ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور اس انتظار میں رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُن کے لیے آسمان سے رزق اُتارے گا اور وہ کھائیں گے۔ ایسے متوکلین نے اسلام کو سمجھنے میں لغزش کھائی ہے کیونکہ توکل علی اللہ جہد و عمل کے منافی نہیں بلکہ مسلمان کا وتیرہ تو اس سلسلے میں یہ ہونا چاہیے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بدو سے فرمایا تھا جس نے اللہ پر توکل کرتے ہوئے اپنی اونٹنی کو کھلا چھوڑ دیا تھا۔ آپؐ نے اس سے فرمایا "اونٹنی کو باندھ اور پھر خدا پر توکل کر"۔

توکل علی اللہ کے مدعیان اپنے موقف کی حمایت میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: لَوْ تَوَكَّلْتُمْ عَلَى اللّٰهِ حَقَّ تَوَكُّلِهٖ لَرَزَقَكُمْ كَمَا تُرْزَقُ الطَّيْرُ تَغْدُوْ خِمَاصًا وَتَرُوْحُ بِطَانًا (اگر تم اللہ پر کما حقہٗ توکل کرو تو وہ تمہیں اس طرح رزق عطا فرمائیگا جس طرح کہ اُن پرندوں کو رزق دیا جاتا ہے جو صبح کے وقت خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام کو پُرشکم ہو کر واپس لوٹتے ہیں)۔ مگر انہوں نے اس حدیث کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ حدیث میں لفظ تَغْدُوْا وارد ہوا ہے جس کا مادہ "غدوٌ" ہے، یعنی صبح کے وقت رزق کی تلاش میں نکلنا۔ حدیث میں یہ نہیں کہا گیا ہے

کہ پرندے گھونسلے میں بیٹھے رہتے ہیں اور پھر خدا ان کو وہاں رزق پہنچاتا ہے، بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ جس طرح پرندے خدائی زمین سے رزق حاصل کرنے نکلتے ہیں اور پیٹ بھر کر واپس آتے ہیں اسی طرح تم بھی نکلو، تمہارے لیے بھی خدا نے اپنی زمین پر رزق کا سامان پھیلا رکھا ہے۔

ایک دفعہ امام احمد بن حنبلؒ سے پوچھا گیا: اس شخص کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو اپنے گھر میں یا مسجد میں بیٹھ رہتا ہے اور کہتا ہے کہ میں کوئی کام نہیں کروں گا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ مجھے رزق عطا فرمائے گا۔" امام حنبلؒ نے فرمایا" یہ شخص جاہلِ مطلق ہے کیا اس نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا یہ فرمان نہیں سنا کہ "جُعِلَ رِزْقِی تحت ظلّ رُمحِي (میرا رزق میرے نیزے کے سائے میں رکھا گیا ہے)۔ اور آنحضرت صلعم کا یہ ارشاد اسے معلوم نہیں کہ پرندے صبح کے وقت تلاشِ رزق میں خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام کو پُرشکم ہو کر لوٹتے ہیں"۔ اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم کے صحابہؓ بحر و بر میں تجارت کیا کرتے تھے اور اپنے نخلستانوں میں کام کیا کرتے ہیں۔ ان کا عمل ہمارے لیے نمونہ ہے۔

انسان اور کائنات کی تخلیق میں سنت اللہ کا تقاضا یہ ہے کہ روئے زمین پر انسان اور دیگر مخلوقات اپنی خوراک اور دیگر سامانِ زیست کوشش اور محنت سے حاصل کریں، تبھی تو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ (زمین کے اطراف میں پھرو اور اللہ کا عطا کردہ رزق کھاؤ)۔ ایک اور جگہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللّٰهِ (الجمعۃ: ۱۰)	پس جب نماز ادا ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل (روزی) تلاش کرو۔

روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعض لوگوں کو دیکھا کہ توکل علی اللہ کا دعویٰ کر کے نماز کے بعد مسجد میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپؓ نے انہیں اپنے دُرّے سے مارا اور کہا کہ" کوئی شخص تلاشِ رزق کی کوشش ترک کر کے خدا سے یہ دعا نہ کرے کہ اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي (اے اللہ مجھے روزی دے)، درانحالیکہ وہ جانتا ہے کہ آسمان سے سونے اور چاندی کی بارش نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللّٰهِ (جب نماز ہو چکے تو زمین میں

منتشر ہو کر فضلِ الٰہی (رزق و روزی) تلاش کرو)۔

(ب) ترکِ دنیا: بعض لوگ اس وجہ سے کوئی کام نہیں کرتے کہ وہ اللہ کی عبادت کے لیے دنیا سے بالکل کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ جو قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں) تو اس میں اس بات کی ترغیب ہے کہ عبادتِ الٰہی کے لیے دنیا سے کامل طور پر کنارہ کش ہو جاؤ۔ ان کے نزدیک یہ بالکل جائز نہیں کہ عبادتِ الٰہی کو چھوڑ کر کوئی اور کام کیا جائے۔

یہ لوگ ترکِ دنیا کے باب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ہے کہ دنیا کا کوئی کام اگر صحیح نیت سے اور احکامِ اسلام کو مدنظر رکھتے ہوئے انجام دیا جائے تو وہ کام بجائے خود ایک عبادت بن جاتا ہے۔ انسان کا اس خیال سے تلاشِ معاش کے لیے نکلنا کہ وہ مال و دولت حاصل کر کے اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ پالے گا، اپنے رشتہ داروں اور ہمسایوں سے بھلائی کرے گا، یا نیک کاموں میں اور راہِ خدا میں اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے خرچ کرے گا، راہِ خدا میں ایک قسم کا جہاد سمجھا جائے گا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تلاشِ معاش کے لیے زمین میں چلنے پھرنے اور جہاد فی سبیل اللہ کو مندرجہ ذیل آیت میں جمع کر دیا ہے:

وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (المزمل: ۲۰)

کچھ اور لوگ ہیں جو اللہ کے فضل کی تلاش میں سفر کرتے ہیں اور کچھ دوسرے لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔

ترمذی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا "جہاد فی سبیل اللہ کے بعد میرے نزدیک موت کے لیے سب سے اچھا وقت وہ ہے جب میں اللہ کا فضل (رزق و روزی) تلاش کر رہا ہوں۔" یہ فرما کر آپؓ نے مذکورہ بالا آیت تلاوت فرمائی۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت کی ترغیب دلانے کے لیے فرمایا ہے: "ایک راست گفتار اور امانت دار تاجر قیامت کے دن انبیاء، صدیقین اور شہدا کے ساتھ ہو گا" (بخاری)۔

زراعت اور کاشت کاری کی ترغیب آپ نے یوں دلائی "کوئی مسلمان جب کوئی چیز کاشت کرتا ہے یا کوئی پودا لگاتا ہے پھر اس میں سے کوئی پرندہ، انسان یا چوپایہ کچھ کھاتا ہے تو وہ اُس مسلمان کی طرف سے صدقہ ہو جاتا ہے" (بخاری)۔ صنعت و حرفت کی ترغیب میں آپؐ نے فرمایا ہے "کسی شخص نے اپنے ہاتھ سے کما کر کھانے سے بہتر کبھی کوئی کھانا نہیں کھایا" اور فرمایا "جس شخص نے اس حال میں رات گزاری کر وہ حلال روزی کی تلاش میں تھک گیا تو اُس نے مغفرت و بخشش سے مالا مال ہو کر رات گزاری"۔

امام ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک دفعہ پُوچھا گیا کہ آپ کے نزدیک کون زیادہ محبوب ہے تاجر راست گفتار یا ہمہ وقتی عبادت گزار؟ آپ نے فرمایا "تاجر راست گفتار! کیونکہ شیطان اُس کے پاس ناپ تول کے وقت اور لینے دینے کے وقت آکر بہکانے کی کوشش کرتا ہے اور وہ اس سے جہاد کرتا ہے"۔

امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کیا ہی اچھا ہو کہ "درزی اپنی سوئی کو اور بڑھئی اپنی آری کو تسبیح بنا لے!"

(ج) کام کرنے کو عار سمجھنا: بعض لوگ کوئی خاص کام اس لیے نہیں کرتے کہ وہ اس کے کرنے میں اپنی سُبکی اور رسوائی محسوس کرتے ہیں۔ مثلاً بہت سے عرب کسی پیشے یا دستکاری کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک عربی شاعر اپنے کسی قرضخواہ کی ہجو کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اُس کے آبا و اجداد میں سے ایک شخص لوہار تھا جیسے لوہار ہونا کوئی شرمناک یا رسوا کُن بات ہو۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دوسروں کے آگے دستِ سوال دراز کر لینے کو کسی ایسے محنت کے کام پر ترجیح دیتے ہیں جسے وہ حقیر اور قابلِ نفرت سمجھتے ہیں۔ اسلام نے ان غلط خیالات کی پُرزور تردید کی ہے، کام اور دستکاریوں کی قدر و قیمت بڑھائی ہے، بیکار رہنے اور دوسروں کے سہارے پر جینے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا ہے اور واضح کیا ہے کہ اسلام کی نظر میں حلال طریقے سے روزی کمانا ایک نہایت ہی شریفانہ فعل ہے، خواہ دوسرے لوگ اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھیں۔

بخاری شریف میں زبیر بن عوامؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم میں سے کوئی شخص ایک رسی لے اور جنگل سے لکڑیوں کا ایک گٹھا لاکر اُسے بازار میں بیچے اور اللہ اس کو بے آبرو ہونے سے

بجائے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے آگے دستِ سوال دراز کرے، وہ چاہیں تو اس کو دیں چاہیں تو نہ دیں"۔ اس حدیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کام خواہ کتنا ہی مشقت طلب ہو اور اُس سے فائدہ خواہ کتنا ہی کم ہو، بیکار رہنے اور دوسروں کے آگے دستِ سوال دراز کرنے سے بدرجہا بہتر ہے۔

بخاری شریف ہی کی ایک حدیث میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی ایسا نہیں مبعوث فرمایا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں"۔ صحابہؓ نے عرض کیا "اے اللہ کے رسولؐ! آپ نے بھی؟" آپؐ نے فرمایا: "ہاں میں بھی چند قیراط کے عوض اہلِ مکہ کی بکریاں چرایا کرتا تھا"۔ مستدرک حاکم میں ابنِ عباس سے روایت ہے کہ داؤد علیہ السلام زرہ ساز تھے، آدم علیہ السلام کاشت کار تھے، نوح علیہ السلام بڑھئی تھے، ادریس علیہ السلام درزی اور موسیٰ علیہ السلام گڈریے تھے۔ تاریخِ اسلام کے بڑے بڑے ائمہ اور علماء جن کی شہرت چاردانگِ عالم پھیلی ہوئی تھی اور جن کو اُن کی علمی و ادبی تالیفات نے زندۂ جاوید بنا دیا ہے اُن میں سے بیشتر اپنے آباؤ اجداد کی نسبت سے مشہور نہیں تھے بلکہ اُن پیشوں کی نسبت سے مشہور تھے جو اُن کے یا اُن کے آباؤ اجداد کے ذریعہ ہائے معاش تھے۔ اور اسلامی معاشرے میں اسے بالکل معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا مثلاً اکثر علماء و آئمہ کے نام کتابوں میں بزّار، قفّال، جصّاص، خیاط، صبّان اور قطّان وغیرہ ملتے ہیں۔ یہ سب پیشوں کے نام ہیں۔

(د) <u>سفر سے گریز</u>: بعض لوگ اس وجہ سے کوئی کام نہیں کرتے کہ انہیں اپنے شہر یا ملک اور اپنی جنم بھومی میں، جہاں اُن کے دوست احباب رہتے ہوں، کام نہیں ملتا اور وہ اپنے وطن یا شہر کو چھوڑ کر باہر جانا نہیں چاہتے۔ وہ اپنے وطن میں بیکار رہنے کو دوسرے علاقوں میں فراخیٔ رزق و مال پر ترجیح دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اسلام نے ہجرت کی ترغیب دی ہے اور اس بات کی حوصلہ افزائی کی ہے کہ وہ تلاشِ معاش میں نکل کھڑے ہوں۔ نیز اُن پر یہ حقیقت واضح کی ہے کہ اللہ کی زمین بڑی وسیع و کشادہ ہے اور انسان کا رزق کسی ایک جگہ میں محدود و محصور نہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص تلاشِ معاش میں اپنے اہلِ وعیال اور وطن سے دُور چلا گیا ہو اور اس حالت میں اُسے موت آجائے تو اُسے اپنے مولد (جائے پیدائش) سے لے کر مدفن (جہاں وہ دفن ہوا ہو) تک کی جگہ

کے برابر جنت میں جگہ دی جائے گی۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں۔ سافروا تستغنوا، "سفر کرو مالدار ہو جاؤ گے" (طبرانی)۔ ارشادِ خداوندی ہے:

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً۔ (النساء-۱۰۰)

اور جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کے لیے بہت جگہ اور بسراوقات کے لیے بڑی گنجائش پائے گا۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مدینہ میں ایک شخص کا انتقال ہو گیا۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور فرمایا "کاش! یہ شخص اپنے مرزبوم (مدینہ) کے سوا کسی جگہ مرتا" حاضرین میں سے ایک آدمی نے کہا "اے اللہ کے رسول! کیوں؟" آپؐ نے فرمایا "جو شخص غریب الدیار مرتا ہے اس کے لیے اپنے مرزبوم سے لے کر جائے موت تک کی جگہ کے برابر جنت میں جگہ ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم مدینہ میں ایک شخص کی قبر پر کھڑے ہوئے اور فرمایا: "کاش! یہ شخص غریب الدیار مرتا!"۔ ان احادیث سے تحریک پاکر پہلے زمانے میں مسلمان دور دراز علاقوں میں نکل جاتے تھے جہاں وہ تبلیغِ دین کا فریضہ انجام دیتے تھے، رزق تلاش کرتے تھے، علم حاصل کرتے تھے اور راہِ خدا میں جہاد کرتے تھے۔

ھ۔ صدقہ و خیرات پر انحصار: بعض لوگ کسی قسم کی محنت و مشقت نہیں کرتے، کوئی کام کرنے یا تلاشِ معاش میں زمین کے مختلف حصّوں میں آنے جانے سے گریز کرتے ہیں اور دوسروں کے صدقہ و خیرات اور زکوٰۃ وغیرہ پر انحصار کرتے ہیں۔ وہ دوسروں سے سوال کرنے کو اپنے لیے مباح سمجھتے ہیں اور باوجود اس کے کہ سوال کرنے میں ایک قسم کی ذلت و رسوائی ہے۔ وہ جسمانی لحاظ سے بالکل ٹھیک ٹھاک ہوتے ہوئے بھی دوسروں کے آگے دستِ سوال دراز کرنے سے ذرا نہیں ہچکچاتے۔ ایسے لوگ مسلمان ملکوں میں اکثر پائے جاتے ہیں۔ بادشاہوں، اُمراء اور اہلِ ثروت کے اردگرد جمع ہونے والے خوشامدی لوگ بھی اسی زمرے میں شمار ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے بارے میں اسلام نے واضح طور پر کہا ہے کہ جب تک وہ طاقتور رہیں اور کمانے کی استطاعت رکھتے ہوں، وہ ہرگز زکوٰۃ و

صدقات لینے کے حقدار نہیں۔ چنانچہ ابوداؤد اور نسائی کی ایک حدیث میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم نے زکوٰۃ مانگنے والے دو آدمیوں سے فرمایا تھا: لَاحَظَّ فِیْھَا لِغَنِیٍّ وَّلَا لِقَوِیٍّ مُّکْتَسِبٍ: (کسی غنی، ہٹے کٹے اور کما سکنے والے کے لیے زکوٰۃ میں کوئی حصہ نہیں)۔ نیز ارشادِ نبوی ہے: "کسی غنی طاقت ور اور سلیم الاعضا شخص کے لیے صدقہ لینا جائز نہیں۔"

اسی طرح اسلام میں لوگوں سے بلاضرورت سوال کرنے (یعنی خیرات و صدقات مانگنے) سے بھی بڑی سختی سے روکا گیا ہے۔ چنانچہ بخاری و مسلم میں ابنِ عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "لوگوں سے ہر وقت مانگتے رہنے والا شخص قیامت کے دن اس طرح آئے گا کہ اس کے چہرے پر ذرا گوشت نہیں ہوگا۔" اور مُسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "جو شخص دوسروں سے بلاضرورت محض اپنے مال میں اضافہ کرنے کے لیے سوال کرتا ہے وہ اپنے لیے انگارے مانگتا ہے، اب چاہے تو اُن انگاروں کو زیادہ کرلے چاہے تو کم کرلے۔"

صحیحین میں ابنِ عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے منبر پر کھڑے ہو کر صدقہ، ناجائز امور سے باز رہنے اور لوگوں سے مانگتے پھرنے پر کلام کرتے ہوئے فرمایا: "اوپر والا (دینے والا) ہاتھ نیچے والے (مانگنے والے) ہاتھ سے بہتر ہے۔" اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "کہ تم میں سے کوئی شخص صبح کے وقت نکلے اور اپنی پُشت پر جنگل سے لکڑیاں اٹھا کر لائے تاکہ وہ صدقہ کرے اور لوگوں سے بے نیاز ہو جائے، یہ اس کے لیے بہتر ہے اس سے کہ وہ کسی آدمی سے کچھ مانگے وہ چاہے تو اُس کو دے چاہے تو نہ دے۔ اس لیے کہ اُوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔" مُسند احمد میں عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "بندہ جونہی دوسروں سے مانگنے کا دروازہ کھولتا ہے اللہ تعالیٰ اُس پر فقر و فاقہ کا دروازہ کھول دیتا ہے۔" اور نسائی میں عائذ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہو کر کچھ مانگا اور آپؐ نے اُسے عطا فرمایا۔ جب اس شخص نے اپنا پاؤں دروازے کی چوکھٹ پر رکھا تو آپؐ نے فرمایا: "اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے

کہ سوال کرنے میں کس قدر ذلت و رسوائی ہے تو کوئی بھی کسی کے پاس سوال کرنے کی غرض سے چل کر نہ جائے"

البتہ دو صورتوں میں سوال کرنا قابلِ مذمت نہیں : ایک یہ کہ حاکمِ وقت یا کسی ایسے شخص سے سوال کیا جائے جسے اللہ نے سائل کا سرپرست بنا دیا ہو۔ دوسرے یہ کہ کسی اشد اور ناگزیر ضرورت سے مجبور ہو کر سوال کیا جائے۔ اسلامی ریاست میں حاکمِ وقت کو یہ اختیار ہے کہ وہ ہر اُس شخص کو سزا دے جو بالکل تندرست و توانا ہو اور کما کر کھانے کی قدرت رکھنے کے باوجود سوسائٹی پر بوجھ بن کر زندہ رہنا چاہتا ہو، اور جس نے دوسروں سے مانگتے پھرنے کو پیشہ بنا لیا ہو، اور جو اس زعم میں مبتلا ہو کہ زکوٰۃ لینا اس کے لیے جائز ہے حالانکہ اُس کے لیے زکوٰۃ لینا حرام ہے۔ بغیر کسی جائز عذر کے بھیک مانگنا گناہ ہے اور ہر وہ گناہ جس پر از روئے شریعت کوئی حد نہ لگائی گئی ہو یا کوئی کفارہ نہ دینا پڑتا ہو مسلمان حاکم کے لیے جائز ہے کہ وہ اُس گناہ کا ارتکاب کرنے والے کو حسبِ حال کوئی سزا دے دے۔

(باقی)

شریعتِ اسلامی کے بنیادی ضابطے

— تالیف: احمد حسن الخطیب مصری —

[فقہائے اسلام نے اسلامی احکام و قوانین کی تدوین میں قرآن اور حدیث سے ماخوذ جن اصولی ہدایات کو اختیار کیا ہے انہیں فقہاء کی اصطلاح میں "قواعد و کلیات" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اصولِ فقہ کی کتابوں میں اس طرح کے قواعد و کلیات پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے جو شخص اسلامی قوانین کی رُوح اور اصل کو سمجھنا چاہتا ہو یا آئندہ کے لیے اسلامی قوانین کی تدوین کرنا چاہتا ہو اس کے لیے ان قواعد و ضوابط کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ مصر کے نامور اہلِ علم حسن احمد الخطیب نے اس موضوع پر نہایت اچھی کاوش کی ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب فقہ الاسلام میں اِن تمام قواعد و ضوابط کو یکجا جمع کر دیا ہے اور مختصر طور پر ہر قاعدے کی تشریح مثالوں کی روشنی میں کر دی ہے۔ انہوں نے ان ضوابط کی کل تعداد ۸۴ بیان کی ہے۔ چنانچہ ہم ان تمام ضوابط کا ترجمہ و تشریح قارئین ترجمان القرآن کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں وقت کی یہ نہایت اہم ضرورت ہے]

پہلا ضابطہ: الحکم یتبع المصلحۃ الراجحۃ (حکم راجح مصلحت کے تابع ہوتا ہے)۔

اس ضابطہ کی وضاحت یہ ہے کہ مثلاً عبادات، جہاد، مالی انفاق اور اس طرح کے بہت سے امور میں نقصان کا پہلو بھی ہوتا ہے، لیکن چونکہ ان کا فائدہ ان کی خرابی پر غالب ہے اس لیے شارع نے ان کے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے برعکس جس فعل میں بُرائی کا پلڑا اُس کے فائدہ پر غالب ہوتا ہے شریعت اُسے حرام قرار دے دیتی ہے۔ چنانچہ شراب، جُوا، فواحش اور ظلم ان سے

انسان کو کبھی منافع اور مفادات بھی حاصل ہو جاتے ہیں، لیکن چونکہ ان کے مفاسد ان کی بھلائیوں کی نسبت غالب ہیں اس لیے اللہ اور اس کے رسول نے ان سے منع فرمایا ہے۔ یہ وہ فقہی ضابطہ ہے جس کا لحاظ شریعت کے احکام میں نہایت ضروری ہے[۱]۔

دوسرا ضابطہ: الضرر یُزال اور لا ضرر ولا ضرار[۲] (ضرر کو دُور کیا جانا چاہیے یا نہ ضرر رسانی میں ابتدا کی جائے اور نہ ضرر کا بدلہ لینے میں مبالغہ کیا جائے):

اِس ضابطہ کی بنیاد نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی اس حدیث پر رکھی گئی ہے کہ لا ضرر ولا ضرار (نہ کسی کو نقصان پہنچایا جائے اور نہ کسی کے نقصان کے جواب میں مبالغہ اور زیادتی کی جائے)۔ ایک دوسری روایت میں اس حدیث کے الفاظ یوں ہیں: لا ضرر ولا ضرار فی الاسلام۔ یہ وہ ضابطہ ہے جو فقہ کے اکثر و بیشتر ابواب کا ماخذ ہے۔ اور اس ضابطہ سے اخذ ہونے والے فروعی احکام سے یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ اسلامی شریعت عدل و انصاف کے قیام اور ظلم و زیادتی کے ازالہ کی خاطر افراد اور جماعتوں کو نقصان سے بچانے کی انتہائی حریص ہے تاکہ لوگ اپنے حقوق کے بارے میں پوری طرح مطمئن ہوں۔ فقہ کے بکثرت احکام اس ضابطہ سے مستنبط ہوئے ہیں۔ مثلاً بعض ائمہ کی رائے میں بیٹیوں کو چھوڑ کر صرف بیٹوں پر مال کو وقف کرنا صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کسی وقف سے مراد قرض خواہوں کو نقصان پہنچانا ہو تو وہ وقف بھی حرام ہے۔ بلکہ اِس صورت میں بعض علماء کے نزدیک اس وقف کو توڑ دینا جائز ہے۔ جن فقہاء کے نزدیک شریک (حصہ دار) اور پڑوسی کو شُفعہ کا حق دیا گیا ہے وہ بھی اسی ضابطہ سے ماخوذ ہے۔ عیب واضح ہو جانے کی صورت میں فروخت کی ہوئی چیز بائع کو لوٹائی جا سکتی ہے۔ اسباب حجر متحقق ہو جانے پر حجر نافذ کر دیا جائیگا۔ قصاص، حدود و کفارات اور تلف شدہ اشیاء

---

[۱] ملاحظہ ہو التوسل والوسیلۃ، تالیف ابن تیمیہؒ ص ۵۰، المنار کا دوسرا ایڈیشن

[۲] "المغرب" میں لا ضرر ولا ضرار کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ آدمی اپنے بھائی کی ضرر رسانی میں نہ ابتدا کرے نہ اس کی طرف سے ضرر رسانی ہونے کی صورت میں انتقاماً اُسے ضرر پہنچائے۔ ضرار اس انتقامی کارروائی کو کہتے ہیں

کی ضمانت یہ تمام امور اسی ضابطہ کی فروع ہیں۔ فقہ کی بعض کتابوں کے اندر یہ کتنا حیرت انگیز عادلانہ مسئلہ وارد ہے کہ اگر ایک شخص اپنے درخت کی شاخوں کو فروخت کرے اور خریدار جب شاخوں کو کاٹنے کے لیے درخت پر چڑھے تو اس سے ہمسایوں کی بے پردگی ہوتی ہو تو خریدار پر یہ لازم ہے کہ وہ چڑھتے وقت ہمسایوں کو ایک مرتبہ یا دو مرتبہ خبردار کر دے تاکہ وہ پردہ کرلیں۔ اگر خریدار ایسا نہ کرے تو یہ معاملہ قاضی کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے اور قاضی اُسے درخت پر چڑھنے سے روک سکتا ہے[1]۔

جو ضرر پہنچانے والے کے خلاف کی جاتی ہے۔ چنانچہ زیر بحث حدیث میں عفو و درگزر کی ترغیب دی گئی ہے۔ یا ضرار کا یہ مفہوم ہو سکتا ہے کہ جس آدمی نے کسی کو نقصان پہنچایا ہو اُسے وہ جواباً نقصان پہنچانے میں مبالغہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ۔ "جو شخص تم پر زیادتی کرے اس پر تم اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے تم پر کی ہے"۔ یہ قول بھی منقول ہے کہ ضرر ایک آدمی کا فعل ہے اور ضرار دو آدمیوں کا فعل۔ ایک اور قول میں ضرر اور ضرار دونوں کا ایک ہی مفہوم بتایا گیا ہے۔ صاحب النہایہ نے اس حدیث کی تاویل میں کئی پہلو ذکر کیے ہیں جن میں سے اکثر و بیشتر ہماری مذکورہ بالا تشریح سے ہم آہنگ ہیں۔ صاحب النہایہ لکھتے ہیں: لا ضرر سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنے بھائی کو نقصان نہ پہنچائے یعنی اُس کے حق میں سے کوئی چیز کم نہ کرے۔ اور ضرار ضرّ سے فعال کے وزن پر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے بھائی کو اس بنا پر مبتلائے نقصان کرے کہ اس نے بھی اُسے نقصان پہنچایا تھا۔ ضرر ایک آدمی کے فعل کو کہتے ہیں۔ اور ضرار اُس فعل کو جس میں دو آدمی شریک ہو جائیں۔ ضرر آغاز فعل کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ضرار اس کی جزا کے لیے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ضرر اُس کام کو کہتے ہیں جس سے تو اپنے ساتھی کو نقصان پہنچائے مگر تو خود اس کام سے منفعت حاصل کرے۔ اور ضرار وہ کام ہے جس سے تو اپنے ساتھی کو نقصان پہنچائے اور خود بھی اس سے کوئی منفعت نہ حاصل کر پائے۔ ملاحظہ ہو النہایہ فی غریب الحدیث جلد سوم، طبع ۱۳۱۱ھ۔

[1] الاشباہ والنظائر ص ۱۱۸ طبع ۱۲۹۰ھ

تیسرا ضابطہ: الضرورات تبیح المحظورات (اضطراری حالت ممنوع چیز کو مباح کر دیتی ہے)۔
اس ضابطہ کی بنا پر انسان کے لیے یہ جائز ہے کہ اگر لقمہ اُس کے حلق میں اٹک گیا ہو اور شراب کے علاوہ اُس کے پاس کوئی چیز موجود نہ ہو تو وہ شراب کے ساتھ اُسے حلق سے نیچے اُتار سکتا ہے۔ اسی طرح شدید بھوک کے وقت حلال غذا نہ مل سکے تو مردار کھانا جائز ہے۔ حالتِ جبر میں کلمۂ کفر زبان سے ادا کر سکتا ہے۔ اگر بوجھ کی کثرت کی وجہ سے کشتی کے غرق ہو جانے کا اندیشہ ہو تو سازو سامان کو تلف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر کسی انسان کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ دوسرے انسان کو قتل کرے ورنہ خود اُسے قتل کر دیا جائے گا تو ایسی صورت میں اُسے اپنی جان بچانے کی خاطر دوسرے کو قتل کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ اُس کا اپنے آپ کو قتل کرنا دوسرے کو قتل کرنے کی نسبت کم نقصان دہ ہے۔ مذکورۂ بالا ضابطہ کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر قائم ہے:

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۔ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۔ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۔

اللہ نے تم پر حرام کر دیا ہے مردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔ البتہ بھوک سے مجبور ہو کر اگر کوئی ان چیزوں کو کھا لے بغیر اس کے کہ وہ قانونِ الٰہی کی خلاف ورزی کا خواہشمند ہو یا حدِ ضرورت سے تجاوز کا مرتکب ہو تو یقیناً اللہ معاف کرنے اور رحم فرمانے والا ہے۔

علمائے فقہ نے اس آیت کو ماخذ قرار دے کر بکثرت احکام اور فیصلوں پر اسے منطبق کیا ہے۔
روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک عورت پیش کی گئی جس نے زنا کا ارتکاب کیا تھا۔ اُس عورت نے زنا کا اقرار کر لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے رجم کا حکم جاری فرمایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ سُن کر کہا: "ہو سکتا ہے اُسے کوئی عذر لاحق ہوا ہو۔" چنانچہ انہوں نے اس عورت سے دریافت کیا: "کس چیز نے تجھے زنا پر آمادہ کیا؟" عورت نے جواب دیا: "میرا ایک ساجھی ہے۔ اُس کے اونٹوں میں پانی بھی تھا اور دودھ بھی۔ میرے اونٹوں میں نہ پانی تھا اور نہ دودھ۔ مجھے

پیاس لگی۔ مَیں نے اُس سے پانی مانگا۔ اُس نے مجھے پانی دینے سے انکار کر دیا مگر اس شرط پر کہ مَیں اپنا جسم اُس کے حوالے کر دوں۔ مَیں نے تین مرتبہ اس بات سے انکار کیا۔ جب میں پیاس سے نڈھال ہو گئی اور مجھے گمان ہوا کہ میری جان نکل جائے گی تو مَیں نے اُس کی خواہش پوری کر دی، اس کے بعد اُس نے مجھے پانی پلایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ سُن کر پکار اُٹھے "اللہ اکبر! فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیہ۔ ان اللہ غفور رحیم"[۱]

چوتھا ضابطہ: ما اُبیح للضرورۃ یقدر بقدرھا (ضرورت کے تحت مباح ہونے والی چیز صرف بقدرِ ضرورت ہی مباح ہوگی):

چنانچہ اضطرار کی حالت میں مردار کھانے والے شخص کے لیے اُسی حد تک مردار حلال ہے جو سدِرمق کے لیے کافی ہو۔ فقہاء نے کہا ہے: شہید کا خون اُس کی اپنی ذات کے لیے تو طاہر اور پاک ہے مگر دوسرے کے لیے وہ نجس ہی ہے۔ کیونکہ شہید کو جو اضطرار لاحق ہے وہ دوسرے کو لاحق نہیں ہے۔ اسی ضابطے کی رُو سے طبیب کے لیے جسم کے پوشیدہ حصوں کو دیکھنا جائز تو ہے مگر صرف اُسی حد تک جس حد تک ضرورت تقاضا کرے۔

پانچواں ضابطہ: الضرر لا یزال بالضرر (ضرر کا ازالہ ضرر کے ذریعہ نہیں کیا جائے گا):

اس کی مثال یہ ہے کہ ایک "مُضطر" (اضطراری حالت میں مبتلا ہونے والا) دوسرے مُضطر کے کھانے کو نہیں کھا سکتا۔ کیونکہ اس صورت میں ایک شخص اپنا ضرر دُور کرنے کی خاطر دوسرے کے لیے باعثِ ضرر بن جاتا ہے۔

چھٹا ضابطہ: یُتحمّل الضرر الخاص لأجل دفع الضرر العام (اجتماعی نقصان کو زائل کرنے کے لیے شخصی نقصان برداشت کیا جائے گا):

یہ فقہ کا ایک نہایت عظیم الشان ضابطہ ہے۔ اور اس سے بصراحت یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جب فرد اور جماعت کے مفاد میں تعارض واقع ہو جائے تو شریعت فرد کے مفاد کے مقابلے میں جماعت

---

[۱] الطرق الحکمیۃ۔ تالیف ابن القیم ص ۵۳ طبع ۱۳۱۷ھ

کے مفاد کو ترجیح دیتی ہے۔ اس ضابطے کے تحت بے شمار فروعی اور ضمنی احکام وارد ہیں۔ مثلاً اگر کفار کی فوجیں مسلمان قیدیوں کو جنگ میں ڈھال بنا رہی ہوں تو اس کی پروا کیے بغیر کہ تیر کسی مسلمان کو بھی لگ جائے گا، کفار پر تیر اندازی کی جاسکتی ہے۔ اگر کوئی طبیب جاہل اور اناڑی ہو یا کوئی مفتی بدکردار ہو یا کوئی تاجر دیوالیہ ہو تو انہیں ان کاموں سے قانوناً روکا جاسکتا ہے خواہ وہ آزاد اور عاقل و بالغ ہوں۔ بلکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ان تین اشخاص کے بارے میں اپنے اس مشہور اصول کو بھی ترک کر دیا ہے کہ جو شخص اپنی ذاتی ملکیت کے اندر کسی قسم کا تصرف کرتا ہے تو اسے حکماً اس سے منع نہیں کیا جاسکتا خواہ اس سے دوسرے کو ضرر ہی لاحق ہوتا ہو۔ امام صاحب نے ان اشخاص کے بارے میں اپنا اصول نظرانداز کر کے زیربحث ضابطے کو اس لیے اختیار کر لیا ہے کہ وہ ایک ایسے اجتماعی نقصان کو روکنا چاہتے ہیں جو مذکورہ بالا تینوں اشخاص کے انفرادی تصرفات سے پوری جماعت کو پہنچ سکتا ہے۔ اسی طرح بعض ائمہ کرام نے بیوقوف اور نادان کے مالی تصرفات پر پابندی کو جائز ٹھیرایا ہے۔ اسی طرح مقروض کے مال کو فروخت کر دینا جائز ہے تاکہ اُس پر عائد ہونے والا قرض ادا کر دیا جائے اور قرض خواہوں کو ضرر سے بچایا جائے۔ اسی ضابطے کے مطابق حاکم کو اس امر کی اجازت ہے کہ اشیاء کے نرخ مقرر کر دے اگر وہ یہ دیکھے کہ نرخ بندی نہ ہونے کی وجہ سے اشیاء کی قیمتیں چڑھ رہی ہیں اور لوگ نقصان میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ چنانچہ فقہاء کا یہ قول ہے کہ "سلطان کے لیے اشیاء کی نرخ بندی کرنا درست نہیں ہے الّا یہ کہ غلّہ کے مالک قیمت کے اندر ظالمانہ تجاوز کر رہے ہوں۔ اسی ضابطے کی رُو سے ذخیرہ اندوز کا غلّہ جبراً فروخت کیا جاسکتا ہے جب کہ لوگوں کو غلّہ کی شدید ضرورت ہو اور وہ فروخت کرنے سے گریز کر رہا ہو۔ اس سے مقصد اجتماعی نقصان کا ازالہ ہے۔

اسی ضابطے سے ملتا جلتا فقہاء کا یہ قول ہے کہ "اگر ایک ہی معاملے میں دو ضرر جمع ہو جائیں جن میں سے ایک ضرر دوسرے کی نسبت زیادہ عظیم ہو تو شدید تر ضرر کا ازالہ کرنے کے لیے خفیف ضرر کو قبول کیا جاسکتا ہے۔ اس ضابطے کو "اختیار اخفّ الضّررین" (دو نقصانوں میں سے ہلکے نقصان کو اختیار کرنا) سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگر کسی مرنے والے شخص یا کسی کم سن بچے کا قرض کسی دوسرے

شخص کے ذمہ ہو اور متروض قرض سے انکار کر دے اور گواہ بھی کوئی موجود نہ ہو تو میت یا کم سن بچے کے وصی کے لیے قانوناً یہ درست ہے کہ وہ مقروض سے قرض کے بعض حصوں پر ہی مصالحت کر لے۔ اور یُوں دو نقصانات میں سے ہلکے نقصان کو قبول کر لے۔ کیونکہ اگر ایسی صورت میں قرض کے بعض حصوں پر مصالحت صحیح نہ مانی جائے تو کم سن بچے کا پُورا مال ضائع ہو جائے گا۔ لیکن اگر مقروض قرض کا اقرار کر رہا ہو یا کوئی گواہ موجود ہو تو پھر وصی کو پُورے قرض کے بجائے کم تر رقم پر مصالحت کا حق نہ ہوگا۔

ساتواں ضابطہ: اذا تعارضت مفسدتان، ارتکب اخفھما وعُدل عن اعظمھما ضرراً (جب دو برائیاں ایک ہی وقت میں پیش آجائیں تو ان دونوں میں سے ہلکی برائی کا ارتکاب کیا جائے گا اور زیادہ نقصان کی حامل بُرائی سے بچا جائے گا):

اس کی مثال یہ ہے: ایک شخص زخمی ہے اور وہ نماز پڑھنی چاہتا ہے۔ اگر وہ سجدہ کرتا ہے تو اُس کا زخم بہنے لگتا ہے۔ اور اگر سجدہ نہ کرے تو زخم نہیں بہتا۔ اس صورت میں حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ وہ شخص بیٹھ کر نماز پڑھے اور رکوع اور سجدہ کو اشارہ سے ادا کرے۔ کیونکہ سجدے کا ترک کر دینا بحالت حدث نماز پڑھنے سے کم تر مضر ہے۔

اِس ضابطے کی دوسری مثال یہ ہے کہ اگر سچ بولنے سے کوئی بڑی خرابی رونما ہو جاتی ہو تو فقہاء نے اس موقع پر جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے۔ حمَوی نے الاشباہ والنظائر کی شرح میں اِس مسئلے پر بتفصیل کلام کیا ہے[۵]۔ حمَوی کی بحث کا خلاصہ یہ ہے: جھوٹ بولنا تین مواقع پر جائز ہے۔ لوگوں کے درمیان صلح کرانے کے لیے۔ جنگ کے اندر۔ بیوی کے سامنے اُس کی اصلاح کے پیش نظر۔ اس جھوٹ سے مراد بھی کذب صریح نہیں ہے بلکہ تورِیہ اور کنایہ سے کام لیا جانا چاہیے۔ یہ قول بھی منقول ہے کہ کسی حق کو زندہ کرنے کے لیے یا کسی ظلم کو دفع کرنے کے لیے بھی کذب مباح ہے۔ بلکہ اگر کسی شخص کو یہ یقین ہو جائے کہ ظلم سے اُس کی نجات صرف جھوٹ بولنے ہی سے ہو سکتی ہے تو اُس کے لیے کھلا کھلا جھوٹ بول دینا بھی جائز ہے۔ حتیٰ کہ بعض صورتوں میں تو اُس کے لیے جھوٹ بولنا واجب ہو گا۔ جیسا کہ مثلاً مسلمان اگر

---

[۵] ملاحظہ ہو الحمَوی جلد اوّل ص ۱۲۱ طبع ۱۲۹۰ھ

دشمن سے صرف اسی صورت میں بچ سکتے ہوں کہ جھوٹ بولا جائے، یا کوئی ظالم کسی شخص کی امانت زبردستی چھین لینا چاہتا ہے اور اسی نیت سے وہ کسی دوسرے شخص سے اس امانت کو دریافت کرتا ہے تو اس کے لیے اس کا انکار کر دینا اور یہ جھوٹ بول دینا واجب ہے کہ اُسے یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ امانت کس جگہ رکھی ہوئی ہے"۔

آٹھواں ضابطہ: درء المفاسد مقدم علی جلب المصالح (ازالۂ مفاسد جلب منفعت پر مقدم ہے): اگر ایک ہی چیز میں بُرائی اور بھلائی دونوں جمع ہو جائیں تو اکثر و بیشتر حالات میں بُرائی کے ازالہ کو مقدم رکھا جائے گا اور فائدے کو نظر انداز کر دیا جائے گا۔ اسی قاعدے کی رُو سے شراب اور قمار کی حرمت وارد ہوتی ہے۔ شراب اور قمار دونوں میں سے ہر ایک کے اندر انسانوں کے لیے منافع اور مصالح پائے جاتے ہیں لیکن ان دونوں کا گناہ اور مضرت ہر لحاظ سے بڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا" (اے نبی، لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیں کہ ان کے اندر بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے فوائد بھی ہیں۔ مگر ان دونوں کا گناہ ان کے منافع سے بہت بڑا ہے)۔ اسی قاعدے کے موجب شیخ محمد عبدہ تعدد ازواج سے اس صورت میں منع کیا کرتے تھے جب کہ بیویوں، اولاد اور زوجین کے خاندانوں کے اندر جھگڑے برپا ہونے لگیں[۶]۔

اس ضابطے کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ وضو کرنے والے کے لیے کلی کرنے یا ناک صاف کرنے میں مبالغہ کرنا مسنون ہے لیکن یہ روزہ دار کے لیے مکروہ ہے کیونکہ اس میں اندیشہ ہے کہ پانی حلق سے اُتر جائے گا[۷]۔

نواں ضابطہ: الیسر ورفع الحرج - والمشقة تجلب التيسير (نرمی کی جائے اور تنگی کو دُور کیا جائے۔ مشقت اس کی مقتضی ہے کہ سہولت پیدا کی جائے):

---

[۶] نداء الجنس اللطیف تالیف سید رشید رضا ص ۲۹۔

[۷] ملاحظہ ہو الاشباہ والنظائر جلد اول ص ۱۲۵ و ۱۲۶ طبع ۱۲۹۰ھ

اس ضابطہ کی بنیاد مندرجہ ذیل آیات و احادیث پر قائم ہے:

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ۔ — اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے وہ تمہارے لیے تنگی نہیں چاہتا۔

مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ۔ — اُس نے دین کے اندر تمہارے لیئے تنگی نہیں رکھی ہے۔

امام احمدؒ نے مُسند میں جابر بن عبداللہ اور ابو اُمامہ سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: احبّ الدین الی اللہ الحنیفیّۃ السَّمحۃ (اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ترین دین سہل ترین حنیفیت ہے)۔

اسی قاعدہ کی مدد سے بکثرت احکام مرتب کیے گئے جن کے اندر انسان کی فطرت اور اُس کی قوتِ برداشت کا پُورا پُورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ زکوٰۃ اس وقت واجب ہوتی ہے جب مال حدِ نصاب کو پہنچ جائے اور وہ بھی مال کی نہایت معمولی مقدار یعنی چالیسواں حصّہ ہے۔ اسی طرح جب عورت حیض کی حالت میں ہو تو اُسے طلاق دینا (بعض کے نزدیک) مکروہ اور بعض کے نزدیک، حرام ہے تاکہ اس کے لیے عدّت کا وقفہ طویل نہ ہو جائے۔ حائضہ عورت کے لیے روزے کی قضا لازم ہے مگر نماز کی قضا واجب نہیں کی گئی ہے۔ اس میں بھی رفعِ حرج کا اصول کارفرما ہے۔ حج کو عمر میں صرف ایک مرتبہ بشرطِ استطاعت فرض کیا گیا ہے۔ علّامہ ابو السعود نے آیت يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ (اے ایمان والو، نبی سے ان چیزوں کے بارے میں سوال نہ کرو جن کی حقیقت اگر تم پر واضح کر دی جائے تو پھر تمہیں ناگوار گزرے) کی تشریح کرتے ہوئے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہمارے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا۔ آپ نے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کر دیا ہے۔ قبیلہ بنی اسد کا ایک آدمی جسے عُکاشہ بن محصن کہا جاتا تھا اور بعض نے اُسے سراقہ بن مالک بتایا ہے، اُٹھا اور آنجنابؐ سے پوچھنے لگا: یا رسول اللہ!

کیا ہر سال حج کرنا فرض ہے؟ آنحضورؐ نے اس شخص کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ مگر اس شخص نے تین مرتبہ اپنا سوال دُہرایا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تجھ پر افسوس ہے۔ کونسی چیز تجھے بچا سکتی ہے اگر میں "ہاں" کہہ دوں؟ خدا کی قسم اگر میں "ہاں" کہہ دیتا تو پھر ہر سال کے لیے حج فرض ہو جاتا۔ اور اگر فرض ہو جاتا تو تم اس کی ہر سال استطاعت نہ رکھتے۔ تمہارے لیے جو چیز میں نے چھوڑ دی ہے تم بھی اس کے بارے میں مجھ سے پوچھنا چھوڑ دو۔ تم سے پہلے لوگ کثرتِ سوال اور انبیاء سے اختلاف کی بنا پر ہلاک ہو گئے۔ جب میں تمہیں کسی کام کا حکم دوں تو بقدرِ استطاعت تم اُس پر کاربند ہو جاؤ اور جب کسی چیز سے منع کر دوں تو اُس سے رک جاؤ۔"

شریعتِ اسلامی کی تمام رخصتیں اور سہولتیں اسی ضابطے پر مبنی ہیں۔ فقہ کی جزئیات اور احکام کی کثیر تعداد اِس ضابطے سے متفرع ہے۔ اسی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ فقہ کے اکثر ابواب کا ماخذ یہی ضابطہ ہے۔

علماء نے احکام میں تخفیف اور آسانی کے متعدد اسباب بیان کیے ہیں۔ ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

۱۔ بیماری۔ اس سبب کے تحت کئی احکام آتے ہیں۔ اگر بیماری ایسی ہو کہ پانی کو ہاتھ لگانے سے جان کا خوف ہو تو وضو کے بجائے تیمم کر لینا جائز ہے۔ فرض نماز بیٹھ کر پڑھی جا سکتی ہے۔ رمضان کے روزے چھوڑے جا سکتے ہیں۔ حج کے لیے کسی دوسرے شخص کو نائب بنایا جا سکتا ہے جبکہ وہ شرطیں پوری ہوتی ہوں جن کے ساتھ ایسا کرنا جائز ہے۔ احرامِ حج کے دوران ممنوع کام فدیہ ادا کر دینے کے بعد مباح ہو جاتے ہیں۔ اور ایک قول کی رُو سے نجس چیزوں اور شراب کو دوا میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اور ڈاکٹر کے لیے مرد اور عورت کے پوشیدہ حصوں کو بقدرِ ضرورت دیکھنا جائز ہوتا ہے۔

۲۔ سفر۔ اس سے متعلق بھی متعدد احکام وارد ہیں۔ چنانچہ حالتِ سفر میں چار رکعتوں کی نماز میں قصر کیا جاتا ہے۔ رمضان میں روزے ترک کیے جا سکتے ہیں۔ جمعہ اور عیدین کی نمازیں چھوڑی جا سکتی ہیں۔

۳۔ اِکراہ۔ اگر انسان کسی مجبوری اور بے بسی کی حالت میں ہو تو اس کی وجہ سے بھی بعض احکامِ شرعیہ

میں تخفیف ہو جاتی ہے۔

۴۔ نسیان۔ یہ حقوق اللہ کے معاملے میں قابلِ لحاظ عذر ہے چنانچہ نسیان کی وجہ سے گناہ ساقط ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر حکم کو یاد دلانے والا پاس موجود ہو اور حکم کے فراموش ہو جانے کا محرّک بھی موجود ہو تو حکم ساقط ہو جاتا ہے۔ جیساکسی روزے دار کا بھول چوک کے ساتھ کھانا کھا لینا۔ یا جانور کو ذبح کرتے وقت تسمیہ بھول جانا۔ لیکن اگر یاد دلانے والا پاس موجود ہو اور ترکِ حکم کا محرّک بھی موجود نہ ہو تو پھر حکم ساقط نہیں ہو گا جیسے نمازی کا حالتِ نماز میں کوئی چیز کھا لینا لیکن حقوق العباد میں نسیان کا عذر معتبر نہیں ہے۔ اِس بنا پر اگر کوئی شخص بھول کر کسی دوسرے شخص کا مال تلف کر دے تو اس پر تاوان لازم آئے گا۔ تمام فقہاء اس امر پر متفق ہیں کہ چند ایسے مسائل ہیں جن میں نسیان کی وجہ سے معافی نہیں ہو گی۔ مثلاً مُحدِث (بے وضو) اگر بعض اعضاء کو دھونا بھول جائے تو وضو قابلِ اعتبار نہ ہو گا۔ یا قاضی نص شرعی کو بھول جائے اور قیاس کی بنا پر کوئی فیصلہ صادر کر دے تو اس کا یہ فیصلہ صحیح نہ ہو گا۔ اس بحث کی مکمل تفصیل حموی میں ملاحظہ ہو (حموی ص ۱۰۶)۔

۵۔ عُسر اور عموم بلویٰ۔ اس کی مثالیں یہ ہیں: قابلِ معافی نجاست کے ساتھ نماز کا صحیح ہونا۔ اور حائضہ عورت کے لیے نمازوں کی قضا کا واجب نہ ہونا کیونکہ اسے بار بار ان ایام سے سابقہ پیش آتا ہے مگر روزوں کے بارے میں یہ اجازت نہیں ہے (کیونکہ وہ سال بھر میں ایک مرتبہ آتے ہیں)۔ سال بھر میں صرف ایک مہینے میں روزے فرض ہیں۔ حج عمر میں ایک مرتبہ فرض ہے۔ اور زکوٰۃ مال کا صرف چالیسواں حصّہ ہے۔ ان تمام امُور میں تنگی کو رفع کیا گیا ہے اور سہولت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ولی اور وصی یتیم کے مال میں سے اپنی محنت کی اُجرت کی مقدار میں مال کھا سکتے ہیں۔ گواہ اور طبیب کو عورت پر نظر ڈالنے کی اجازت ہے۔ نیز منگنی (خطبہ) کے وقت مرد کے لیے عورت کو دیکھ لینا مباح ہے۔ مرد کو مشروط طور پر چار شادیوں کی اجازت دی گئی ہے اور صرف ایک بیوی پر اکتفا لازم نہیں کیا گیا ہے۔ اس حکم میں ایک طرف مرد کے لیے تیسیر کا اصول ملحوظ رکھا گیا ہے اور دوسری طرف خود اُمّت کی اس مصلحت کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے کہ اگر حالات افزائشِ نسل کا تقاضا کرتے ہوں تو اس

حکم سے استفادہ کیا جائے۔ نیز اگر معاشرے کے اندر عورتوں کی کثرت ہو تو خود عورتوں کے لیے بھی سہولت اسی میں ہے کہ تعددِ ازدواج کا دروازہ کھلا رہے۔ مگر ہر حالت میں مرد کو چار سے زیادہ بیویوں کی اجازت نہیں دی گئی کیونکہ اس میں مرد کے لیے عدل و انصاف اور تقسیمِ اموال وغیرہ میں غیر معمولی مشقت پائی جاتی ہے۔

طلاق کا جواز بھی اسی اصول کے تحت آتا ہے۔ کیونکہ خاوند اور بیوی کے اخلاق و عادات اگر ایک دوسرے سے متصادم ہوں تو اس صورت میں دونوں کا رشتہ زوجیت کے ساتھ بندھا رہنا موجبِ مشقت ہے بلکہ دونوں کا بھلے طریقے سے باہم زندگی بسر کرنا ناممکن ہے۔ وصیت کرنے کی اجازت میں بھی یہی اصول کارفرما ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص اپنی زندگی کے اندر کسی نیکی کے کام سے محروم رہ گیا ہے تو اسے اپنے مال میں سے وصیت کی اجازت ہے تاکہ مرتے وقت اس کی تلافی کر سکے۔ اس کی یہ وصیت ترکہ کے تہائی حصے میں نافذ ہو گی تاکہ وارثوں کو نقصان سے بچایا جا سکے۔ لیکن کوئی وارث نہ ہو تو یہ وصیت پورے کے پورے مال میں بھی نافذ ہو سکتی ہے۔ اسی اصول کی ایک اور مثال یہ ہے کہ قسم کے کفارہ میں یہ اختیار دیا گیا ہے کہ خواہ دس مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے یا انہیں کپڑا پہنایا جائے یا ایک غلام آزاد کیا جائے۔ یہ اختیار اس بنا پر دیا گیا ہے کہ قسم کا استعمال بکثرت ہوتا ہے اور اس کا کفارہ بھی ہر بار لازم آتا ہے مگر دوسرے کفاروں میں یہ اجازت نہیں ہے کیونکہ وہ بہت نادر الوقوع ہوتے ہیں۔ عمومِ بلویٰ (عام آزمائش) کے اندر تیسیر کی مثال یہ ہے کہ مجتہدین کے لیے اجتہادی غلطی کا گناہ ساقط کر دیا گیا ہے اور ان سے صرف ظن کی بنا پر رائے قائم کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اگر انہیں یقین کے ساتھ حکم لگانے کا پابند کیا جاتا تو ان کے لیے امرِ یقین تک پہنچنا دشوار تھا۔

۶۔ نقص (خامی کا وجود)۔ کسی انسان کے اندر فطری نقص پایا جانا بجائے خود مشقت کی ایک قسم ہے۔ اس لیے کہ انسانی نفس کی جبلت میں کمال کی محبت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ تکلیف شرعی اور تخفیف و تیسیر میں پوری پوری مناسبت رکھی گئی ہے۔ بر بنائے نقص مجنون اور نابالغ بچہ شرعاً غیر مکلف قرار دیے گئے ہیں۔ اور مرد پر بعض ایسے امور فرض کر دیے گئے ہیں جن میں عورت مکلف نہیں ہے۔ مثلاً جہاد جبکہ

نفیرِ عام نہ ہو۔ کیونکہ نفیرِ عام کے وقت عورت پر بھی جہاد واجب ہوتا ہے اور خاوند کے اذن کے بغیر بھی جہاد کے لیے نکل سکتی ہے۔[۸]

قاعدہ تیسیر اور رفع حرج کی وضاحت میں امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ قول منقول ہے کہ "جب کسی معاملہ میں تنگی پیدا ہو جاتی ہے تو (احکام کی رُو سے) اس میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے"۔ امام شافعیؒ کے اس قول میں تنگی (ضیق) سے مراد مشقت ہے اور وسعت سے مراد قیاسات اور قواعد کی پابندی سے چھٹکارا ہے۔ حنفی ائمہ کا اس بارے میں یہ مشہور قاعدہ ہے کہ "اضطرار کے مواقع اور تکلیف عام (عموم بلویٰ) کی صورتوں میں سہولت کا راستہ اختیار کیا جائے گا"۔[۹] (باقی)

---

۸ الاشباہ والنظائر، ص ۱۱۷، جلد اوّل۔

۹ ردّ المحتار جلد اوّل ص ۱۳۲- طبع ۱۳۰۸ھ۔

مطبوعات

سوشلزم یا اسلام | تالیف پروفیسر خورشید احمد صاحب۔ شائع کردہ مکتبہ چراغ راہ کراچی۔ صفحات ۳۲۱۔ قیمت ساڑھے پانچ روپے۔

یہ قابل قدر کتاب پروفیسر خورشید احمد صاحب کی وسعتِ مطالعہ، دقتِ نظر، اور گہرے تفکر کی آئینہ دار ہے۔ سوا تین سو صفحات میں انہوں نے اشتراکیت کا اس قدر جامع تجزیہ پیش کیا ہے کہ اس کا کوئی پہلو نظروں سے اوجھل نہیں رہا۔ کتاب کی ابتدا اشتراکیت کے مفہوم سے کی گئی ہے اور اسی باب میں اس نظام کے ارتقاء، اس کی ہمہ گیری، اشتراکیت اور اشتمالیت میں فرق کے بارے میں قریب قریب سارے مباحث شامل ہیں۔ دوسرے باب میں پروفیسر صاحب نے اشتراکیت کے مثبت پہلوؤں کا جائزہ پیش کیا ہے اس کے بعد اشتراکیت کی فکری اور نظری الجھنیں بیان کی گئی ہیں۔ پھر اشتراکیت کے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے جن میں اُس کی اصل ناکامی کے راز مُضمر ہیں۔

پروفیسر صاحب نے صرف نظری مباحث پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ عالمِ واقعات میں اشتراکیت کی ناکامیوں سے بھی بحث کی ہے اور پورے دلائل کے ساتھ یہ حقیقت واضح کی ہے کہ اشتراکیت کا گہوارہ روس اشتراکی اصولوں کا مدفن ہے اور اس کے نظامِ معیشت میں وہ ساری خرابیاں موجود ہیں جو کسی سرمایہ دارانہ نظام میں پائی جاتی ہیں۔ کتاب کے آخری حصے میں فاضل مصنف نے اشتراکیت کے مقابلے میں اسلامی نظامِ حیات کی برتری ثابت کی ہے۔

مصنف کا اندازِ بیان بڑا علمی اور دلچسپ ہے۔ انہوں نے جو بات کہی ہے اس کے حق میں ناقابلِ تردید شواہد پیش کیے ہیں۔ ہم اس کتاب کے مطالعہ کی پُرزور سفارش کرتے ہیں۔ اُردو زبان میں

اس سے زیادہ جامع اور وزنی کتاب دیکھنے میں نہیں آئی۔ اس کا انگریزی اور عربی میں ترجمہ بھی بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

معیارِ کتابت وطباعت عمدہ ہے۔

اسلامی تحقیق کا مفہوم، مدعا اور طریقِ کار | ڈاکٹر محمد رفیع الدین۔ ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی لٹ۔
شائع کردہ: دار الاشاعت الاسلامیہ لاہور۔ قیمت ایک روپیہ۔

ڈاکٹر رفیع الدین صاحب مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے فہمِ رسا کے ساتھ دلِ بیدار بھی دے رکھا تھا۔ انہوں نے اسلام کے جن پہلوؤں پر لکھا، بڑے تدبّر، دانائی اور مومنانہ بصیرت کے ساتھ لکھا۔ یہ کتابچہ ان کی سلامتیٔ فکر کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ اس میں انہوں نے ملک کے تحقیقِ اسلامی کے اداروں کو ان کی اصل ذمہ داریوں کا احساس دلایا ہے اور انہیں بتایا ہے کہ بحیثیت مسلمان ہمیں کس نہج اور انداز پر تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔

A BOOK OF QURANIC LAWS قرآنی قوانین کی کتاب | تالیف: محمد ولی بھائی سوداگر۔ ناشر: شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور۔ قیمت ساڑھے سات روپے۔ صفحات ۱۹۵

اس کتاب میں مصنف نے توحید، عبادات، صدقہ و خیرات، روزہ، حج، اکل و شرب کے بارے میں اسلامی ضابطے اور قوانین، نکاح، طلاق، وراثت، سود اور پردہ کے بارے میں قرآن مجید کے احکام کو یکجا کر دیا ہے۔ آیات کے ترجمہ کے لیے راڈویل کا ترجمۂ قرآن سامنے رکھا گیا ہے۔ اس طرح اس کے ترجمے کے بہت سے اسقام بھی کتاب میں منتقل ہو گئے ہیں۔ جو انگریزی دان مندرجہ بالا موضوعات پر قرآن مجید کی آیات کو یکجا دیکھنا چاہتے ہیں انہیں اس مجموعے سے اچھی خاصی رہنمائی مل سکتی ہے۔ مرتب کے بعض ذاتی اجتہادات سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔

طباعت و کتابت کا معیار گوارا ہے۔

(بقیہ اشارات)

دو تین باتیں ہم اس ملک کے اشتراکیت نوازوں سے بھی کہنا چاہتے ہیں۔ پہلی بات جس پر ہم انہیں سوچنے کی دعوت دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ جس انداز سے وہ اپنی تحریک چلا رہے ہیں اور اپنے کارکنوں کے اندر وہ جس سیرت و کردار کی پرورش کر رہے ہیں، اس پر انہیں پوری سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ اگر روس میں وہ غنڈہ گردی اور مار دھاڑ کے ذریعے برسرِ اقتدار آگئے اور عوام کو انہوں نے اپنے آہنی شکنجے میں کس کر خاموش کر دیا تو یہ ضروری نہیں کہ یہاں بھی وہ ان ہتھکنڈوں سے کامیاب ہو سکیں۔ یہاں کے عوام اب پہلے سے زیادہ باشعور ہیں۔ جس طرح روس اجتماعی افکار اور اعمال کے لحاظ سے بے آب و گیاہ زمین تھی، پاکستان میں وہ صورت نہیں ہے۔ یہاں اگرچہ عملاً اسلام کی بہار نہیں آئی مگر لوگوں کے ذہنوں میں اس بہار کا نہایت واضح تصور موجود ہے، اور پاکستان کی عظیم اکثریت اس کی دل و جان سے آرزومند ہے۔ اس ملک کے معاشرتی اور اخلاقی ڈھانچوں میں بھی خدا کے فضل سے اب تک اسلام کا کافی عمل دخل ہے۔ ان حالات میں تشدد کے طریقوں سے تسلط قائم کرنے کی کوشش بہت زیادہ خون خرابے کی باعث تو بن سکتی ہے، مگر آسانی سے کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اور اگر بالفرض ایک حادثہ کے طور پر کامیاب ہو بھی جائے تو زیادہ دیر تک برقرار رہ کر مطلوبہ نتائج پیدا نہیں کر سکتی۔ مشرقِ اوسط میں آپ کی سازشوں اور کوششوں کا انجام آپکے سامنے ہے۔ آپ وہاں اشتراکی تجربے کو تو کامیاب نہیں کر سکے، البتہ یہودیوں سے عربوں کو پٹوانے کا تماشا آپ نے ساری دنیا کو دکھا دیا۔ اگر آپ پاکستان کو محض برباد کرنا چاہتے ہیں تو یہ الگ بات ہے۔ لیکن اگر آپ یہاں فی الحقیقت اشتراکیت نافذ کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو ہزار مرتبہ سوچ لینا چاہیے کہ یہ کھیل یہاں کھیلا جا سکتا ہے یا نہیں۔

دوسرے آپ کو اس بات پر بھی سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ آپ اپنے کارکنوں کی جس انداز

پر تربیت کر رہے ہیں کیا اس سے کسی معاشرے کی تعمیر کا کام لیا جا سکتا ہے؟ تعمیر بڑا صبر آزما اور حکمت و دانائی کا کام ہوتا ہے جس میں بڑی محنت، ریاضت، تدبّر، ضبطِ نفس، ایثار اور غور و فکر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس بنا پر جو تحریکات بھی اپنے سامنے کوئی تعمیری عزائم رکھتی ہیں وہ سب سے زیادہ توجہ اپنے کارکنوں کی سیرت سازی پر دیتی ہیں کیونکہ مثبت انسانی صفات کے پرورش پائے بغیر تعمیر کا کوئی مرحلہ طے نہیں کیا جا سکتا۔ آپ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ نوجوانوں کے اندر جو تخریب پسندانہ ذہنیت اور جو گھٹیا بازاری مذاق پیدا ہو رہا ہے۔ وہ کل آپ کے لیے بھی تکلیف کا باعث بن سکتا ہے۔ گالی گلوچ، ہنگامہ آرائی، افترا پردازی اور دھینگا مشتی سے کس قسم کا ضبطِ نفس پیدا ہو گا؟ اور ان "فنون" میں مہارت حاصل کرنے والے افراد کل کسی تعمیری منصوبے کو کس طرح پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں گے؟ اگر آپ کے پیشِ نظر تخریب کے ساتھ کوئی تعمیر بھی ہے تو پھر آپ کو اس صورتِ حال پر غور کرنا چاہیے۔

تیسری بات ہم آپ سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب آپ اس ملک میں اشتراکیت نافذ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اسی مقصد کے لیے آپ کوشاں ہیں تو پھر سیدھی طرح سامنے آئیے اور اپنے مقصد کو صاف صاف بیان کیجیے۔ یہ "اسلامی مساوات" اور "محمدی نظامِ معیشت" اور "قرآنی نظامِ ربوبیت" کی باتیں جو آپ کر رہے ہیں یہ کھلی دھوکہ بازی ہے۔ آپ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی فریب کاریوں سے آپ عوام کو اپنے ساتھ شامل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ممکن ہے کہ آغاز میں آپ اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب بھی ہو جائیں۔ مگر جب بلّی تھیلے سے باہر آئے گی (اور وہ آ رہی ہے) تو آپ کے لیے بہت زیادہ مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ مکر و فریب کی پالیسی سے لوگوں کے اندر ذہنی انتشار اور عمل کا تضاد پیدا ہو گا جو بالآخر آپ کے لیے موجبِ پریشانی ہو گا۔ دو بالکل متضاد اور متصادم نظامہائے حیات آپ کس طرح نافذ کر سکیں گے؟ ابتدا میں عوام کو دھوکہ دے کر کچھ دُور آپ اپنے ساتھ چلا بھی لے جائیں، تو آخری مرحلے میں جب آپ اسلام کو تیاگ کر اور اشتراکیت کے معاملے میں یکسو ہو کر کوئی کام کرنا چاہیں گے تو جن لوگوں کو اسلام کے نام پر دھوکہ دے کر آپ نے اپنے ساتھ ملایا ہے اُن سے کس طرح گلو خلاصی کرا سکیں گے؟

زندگی کی اُلجھنیں بے شمار ہیں

اِسلام ان کا بہترین حل پیش کرتا ہے

رسائل و مسائل

مولانا مودودی کی عظیم کتاب

جو معاشرتی، معاشی، قانونی پہلوؤں پر اسلام کی روشنی میں آپ کی مکمل رہنمائی کرتی ہے۔

حصہ اول :	اعلیٰ ایڈیشن	۸/- روپے	سستا ایڈیشن	۴/۵۰ روپے
حصہ دوم :	اعلیٰ ایڈیشن	۸/۵۰ روپے	سستا ایڈیشن	۵/۷۵ روپے
حصہ سوم :	اعلیٰ ایڈیشن	۸/- روپے	سستا ایڈیشن	۴/۵۰ روپے
حصہ چہارم :	اعلیٰ ایڈیشن	۶/۷۵ روپے	سستا ایڈیشن	۳/۷۵ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔

۱۳-ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

۱۲- بیت المکرم، اپھار منزل، ڈھاکہ

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے

زندگی پر اس کے ہمہ گیر اثرات سمجھنے کے لیے چند معیاری کتب

اسلامی نظامِ زندگی

مصنف ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام کے اخلاقی، سیاسی، معاشی

اور

معاشرتی تعلیمات کا جامع تعارف

اعلیٰ ایڈیشن ۸/- روپے

سستا ایڈیشن ۵/- روپے

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

مصنف ابوالاعلیٰ مودودی

اسلامی اور غیر اسلامی تہذیب کا فرق

زندگی کے بارے میں اسلام کا صحیح نقطۂ نظر

اعلیٰ ایڈیشن: ۶/۵۰ روپے

سستا ایڈیشن: ۳/۲۵ روپے

نظامِ اسلامی تہذیب اسلامی

مرتبہ

شکیل احمد عامری

مراکش سے انڈونیشیا تک کے چوٹی کے

مسلم مفکرین کے مقالات

اسلام کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث

اعلیٰ ایڈیشن ۶/۵۰ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۳۔ ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

۱۳۔ بیت المکرم (پہلی منزل)۔ ڈھاکہ